جمہوریت، جمہوری اقدار اور نوجوانوں کا کردار

ترتیب وتدوین: غلام مرتضیٰ

ادارہ امن وتعلیم، اسلام آباد

جمہوریت، جمہوری اقدار اور نوجوانوں کا کردار

سیاسی و مذہبی جماعتوں کے نوجوان کارکنان کے لیے رہنما کتابچہ

ترتیب وتدوین:
غلام مرتضیٰ

ادارہ امن و تعلیم
(Peace and Education Foundation)

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب: جمہوریت و جمہوری اقدار اور نوجوانوں کا کردار

مرتب: غلام مرتضیٰ

معاونین: ارسا شفیق، رباب زینب

ضخامت: صفحات

ناشر: ادارہ امن تعلیم اسلام آباد

تعاون: مجلس تحقیقات اسلامی (IRCRA)

ایڈیشن: پہلا ایڈیشن

فہرست مضامین

باب اول: جمہوریت اور جمہوری اقدار

فصل اول: جمہوریت: مفہوم اور اقسام

جمہوریت اور انسانی ارتقاء

جمہوریت کی خوبیاں

فصل دوم: جمہوری اقدار اور اسلامی تعلیمات

باب دوم: ریاست اور اس کے عناصر

فصل اول: مقننہ

فصل دوم: انتظامیہ

فصل سوم: عدلیہ

فصل چہارم: میڈیا

باب سوم: اسلام اور جمہوریت

فصل اول: جمہوریت کا اسلامی تصور

فصل دوم: جمہوریت کے متعلق مذہبی شبہات وخدشات اور ان کا ازالہ

فصل سوم: قومی اور بین الاقوامی قوانین اور اسلام

باب چہارم: اسلامی حکومت کے بنیادی اُصول

فصل اول: بنیادی اصول اور قرارداد مقاصد

فصل دوم: ووٹ کی شرعی حیثیت

باب پنجم: پاکستان میں جمہوریت: مسائل، امکانات، اور ممکنہ حل

باب ششم: نوجوانوں کی سیاست میں شرکت کی اہمیت اور نوجوان قیادت

باب ہفتم: نوجوانوں کے حقوق اور سیاسی عمل میں شرکت میں درپیش چیلنجز

باب ہشتم: جمہوری نظام کو مضبوط بنانے اور امن کو فروغ دینے کے لئے نوجوانوں کے اقدامات اور سرگرمیاں

تعارف

پاکستانی معاشرے میں، خاص طور پر نوجوانوں میں، یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت اور جمہوریت دو مختلف نظام ہیں اور جمہوری نظام اسلام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ یہ فکر پاکستان میں مذہبی گروہوں کے بیانیہ اور ریاست کی اسلامائزیشن پالیسی میں ابہام کی وجہ سے سامنے آئی ہے۔ اگرچہ موجودہ مذہبی سیاسی جماعتیں پاکستان کی مرکزی دھارے کی سیاست کا حصہ ہیں، ملک کے آئین پر یقین رکھتے ہیں اور انتخابی سیاست میں حصہ لیتے ہیں، اس لیے انہیں سیاسی جماعتوں کی درجہ بندی میں شامل کیا جاتا ہے۔ تاہم، ان مذہبی سیاسی جماعتوں کی بنیادی توجہ ریاست میں اسلامی نظام کے نفاذ اور معاشرے کی مذہبی ساخت برقرار رکھنے پر ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی جماعتوں کا خیال ہے کہ پارلیمنٹ کو صرف ان شعبہ جات کی نشاندہی کرنی چاہئے جہاں شرعی قانون سازی کی ضرورت ہے۔

ان مذہبی سیاسی جماعتوں کے علاوہ کچھ اور مذہبی گروہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کے موجودہ سیاسی نظام میں کام کرتے ہوئے تبدیلی لانا ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ جمہوریت کو اسلام کے خلاف خیال کرتے ہیں اور اس کی جگہ شریعت کے اپنے تصور کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان تمام سیاسی یا غیر سیاسی مذہبی گروہوں کے نوجوانوں کے الگ الگ گروپس ہیں جو قدامت پسندوں کے سیاسی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں۔ مختلف مطالعہ جات میں پاکستانی نوجوانوں میں بنیاد پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان کا تجزیہ کیا گیا اور مشاہدہ کیا گیا کہ نوجوانوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ مذہب ان کی زندگیوں میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور وہ ملک میں شریعت کے نفاذ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کے نوجوان مغربی نظامِ حکومت کے خلاف ہیں اور ایک سخت عالمی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان جمہوری اصول واقدار کے مخالف خیالات رکھتے ہیں، جن میں بالخصوص مذہبی آزادی میں قدغن کا نظریہ شامل ہے۔

لہذا، نوجوانوں میں جمہوریت کے تصور اور جمہوری اصولوں کے بارے میں واضح فہم کو فروغ دینا ضروری ہے۔ ادارہ امن و تعلیم تربیتی ورکشاپ کے ذریعہ دینی سیاسی جماعتوں کے نوجوان کے ساتھ ساتھ عام نوجوان سیاسی کارکنوں میں جمہوریت اور جمہوری نظام کے بارے میں شعور اجاگر کرتا ہے۔ ان تربیتی ورکشاپس میں جمہوریت کے خلاف نوجوانوں کے تحفظات کو دور کیا جائے گا اور انہیں سیاسی عمل میں بھرپور کردار کرنے کے لیے مختلف سرگرمیوں میں مشغول کیا جائے گا، جس کے بعد وہ اپنی جماعتوں میں جمہوری اصول واقدار کو فروغ دینے کے اہل ہوں گے۔

غلام مرتضیٰ
ڈائریکٹر، ادارہ امن و تعلیم

باب اول: جمہوریت اور جمہوری اقدار

فصل اول: جمہوریت (Democracy) : مفہوم اور اقسام

مفہوم

جمہوریت کا ماخذ لفظ جمہور یا جمہوری ہے جس کے معنی "عوام یا لوگ" کے ہیں۔ لہذا جمہوریت سے مراد عام لوگوں کی حکومت ہے۔ جمہوریت کے لیے انگریزی کا لفظ (Democracy) استعمال کیا جاتا ہے، یہ لفظ دو یونانی الفاظ Demos اور Cratos سے اخذ کیا گیا ہے، جن کے بالترتیب معنٰی عوام اور طاقت کے ہیں۔ اس طرح جمہوریت کا مطلب ہوا "عوام کی طاقت"۔ گویا یہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں عوام خود یا اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت کرتے ہیں اور حکومت ان کے منشاء کے مطابق فرائض انجام دیتی ہے۔ جمہوریت کی مختلف تعریفات کی رو سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایسی طرزِ حکومت ہے جس میں عوام کی اکثریت کی رائے کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ حکومت تمام افراد کے وسیع تر مفاد کی خاطر قائم کی جاتی ہے۔ اس میں عوام بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے مسائل خود سلجھاتے ہیں اور ہر ایک کو قانونی مساوات حاصل ہوتی ہے۔

ماہرین نے جمہوریت کی مختلف انداز میں تعریفیں کی ہیں۔ چند مشہور تعریفیں مندرجہ ذیل ہیں۔

سیلے Seeley نے جمہوریت کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"جمہوریت ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ہر ایک شریک ہوتا ہے"

لارڈ برائس کے خیال میں:

"جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے جس میں اختیارات ایک فرد واحد یا افراد کے ایک مخصوص طبقہ یا طبقات کی بجائے معاشرے کے تمام افراد کو بحیثیت مجموعی حاصل ہوتے ہیں"

ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے:

"جمہوریت عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے اور عوام کی خاطر"

کسی ملک میں جمہوریت جانچنے کا بڑا سادہ سا پیمانہ یہ ہے کہ کیا اس ملک میں لوگوں کو اپنی بات کے اظہار اور ریاستی پالیسیوں پہ آزادانہ رائے زنی کرنے اور تنقید کرنے کی آزادی ہے یا نہیں؟ کیا اس ملک میں مضبوط اپوزیشن موجود ہے یا نہیں؟ کیا وہاں پہ آئین اور قانون کی حکمرانی ہے یا جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون رائج ہے۔ کیا اس ملک میں اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی ہے یا نہیں؟ قانون کی نظر میں

سب برابر ہیں یا قانون کا اطلاق مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہوتا ہے؟ کیا ہر کسی کی جان اور مال محفوظ ہے یا نہیں؟ معاشی اور معاشرتی انصاف موجود ہے یا معاشرہ طبقاتی نظام میں بٹا ہوا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا اس ملک کا میڈیا آزاد ہے یا اس پہ طرح طرح کی قدغنیں لگائی جاتی ہیں۔

جمہوریت ایک بہترین نظام ہونے کے ناطے عوام پہ کچھ غیر معمولی ذمہ داریاں بھی عائد کرتا ہے۔ جمہوریت کے فروغ کے لئے سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ عوام روشن خیال، تعلیم یافتہ اور باشعور ہوں۔ وہ ہمہ وقت باخبر ہوں اور کسی بھی قیمت پر اپنے بنیادی انسانی حقوق پامال نہ ہونے دیں۔ وہ اپنے حقِ حکمرانی کے تحفظ کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔ اختلافِ رائے کا احترام کیا جائے اور منطقی استدلال پہ کامل یقین رکھا جائے۔ ریاست کے اعضا اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ریاست کی بہتری کے لئے کوشاں رہیں۔ سیاسی پارٹیوں پہ چند افراد یا خاندانوں کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے۔ جمہوریت ہی میں ترقی و خوشحالی کا راز مضمر ہے لیکن ایسا ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب جمہوریت کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو دیانتداری کے ساتھ پورا کیا جائے۔

جمہوریت کی اقسام

جمہوریت کی دو اقسام ہوتی ہیں:

۱۔ بلاواسطہ جمہوریت (Direct Democracy)

۲۔ بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy)

1۔ بلاواسطہ جمہوریت (Direct Democracy)

بلاواسطہ جمہوریت میں عوام براہ راست امورِ حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنے لیے قوانین بناتے اور سرکاری عہدے داروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ جمہوریت کی یہ قسم قدیم یونان اور روم میں رائج تھی۔ یہ ریاستیں رقبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹی اور ان کی آبادی بھی بہت کم تھی۔ تھوڑی اور مختصر آبادی کا ایک جگہ جمع ہونا آسان تھا، اس لیے اس وقت ہر شہری کے لیے ممکن تھا کہ وہ براہِ راست نظم و نسق چلانے میں شریک ہو۔ درحقیقت بلاواسطہ جمہوریت ان چھوٹی ریاستوں ہی میں کامیاب تھی لیکن موجودہ بڑی اور وسیع ریاستوں میں یہ طریقہ قابل عمل نہیں ہے۔ آج کل ایسی جمہوریت کچھ حد تک سوئٹزرلینڈ میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس طریقہ کار کو براہ راست جمہوریت کہا جاتا ہے۔ اب قومی ریاستوں میں براہ راست جمہوریت پر عمل کرنا کافی مشکل ہے۔

2۔ بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy)

آج کل طویل و عریض ریاستوں میں بالواسطہ یا نمائندہ جمہوریت کا طریقہ رائج ہے۔اس طرزِ حکومت میں تمام شہری ملکی معاملات میں براہِ راست حصہ نہیں لے سکتے بلکہ اپنے نمائندوں کے ذریعے کاروبارِ حکومت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ جدید قسم کی جمہوریت ہے۔ جان سٹورٹ مل(John Stuart Mill)نے بالواسطہ جمہوریت کی یہ تعریف کی ہے: "ایسا نظام حکومت جس میں تمام لوگ یاان کی اکثریت اپنے منتخب نمائندوں کے توسط سے اپنے حاکمانہ اختیارات کا استعمال کرتے ہیں"۔

موجودہ دور میں قومی ریاستوں کا رقبہ بہت وسیع اور آبادی بہت زیادہ ہے۔اور ریاست کے تمام شہری ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ قانون وضع کر سکتے ہیں اور نہ کاروبارِ حکومت میں حصہ لے سکتے ہیں۔اس لئے عوام انتخابات کے زریعے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو اپنے رائے دہندگان کی جانب سے کاروبارِ حکومت چلاتے ہیں۔اسی وجہ سے انہیں نمائندہ جمہوریت بھی کہتے ہیں۔ دراصل دورِ جدید میں فلاحی ریاست کے فرائض میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے اور انسانی زندگی بے حد مصروف ہو گئی ہے۔ معاشی جدوجہد کی وجہ سے عام شہریوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ حکومتی فرائض بھی انجام دے سکیں۔اس لئے وہ اپنے نمائندوں کو منتخب کر کے نظامِ حکومت چلانے کا اختیار دے دیتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے قوانین اور فیصلوں کا احترام اور پابندی کرتے ہیں۔ ریاست کے وہ افراد جو سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ عوام کی اکثریت کی تائید سے منتخب ہو کر پارلیمینٹ کے رکن بن جاتے ہیں۔

پارلیمانی نظام (Parliamentary system) یا پارلیمانی جمہوریت (Parliamentary democracy) جمہوری حکومت کا ایک نظام ہے جس میں مجلس عاملہ کے وزراء پارلیمنٹ اور مقننہ کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ پارلیمانی نظام ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں ایک کابینہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک پارلیمنٹ کے تحت کام کرتی ہے۔اس نظام میں اختیارات عموماوزیر اعظم کے پاس ہوتے ہیں۔اس نظام میں صدر تو ہوتا ہے مگر صدر کے اختیارات بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ریاست میں پارلیمانی نظام ہو تو پارلیمینٹ میں اکثریتی جماعت کا قائد کابینہ بناتا ہے۔ کابینہ اپنی کارگزاریوں کے سلسلے میں پارلیمینٹ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے اور پارلیمینٹ کے اراکین عوام کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔

صدارتی نظام(Presidential system)ایک ایسا نظام جمہوریت ہے جس میں سربراہ حکومت سربراہ ریاست بھی ہوتا ہے۔ صدارتی طرز حکومت میں تمام تر انتظامی اختیارات صدر مملکت کے پاس ہوتے ہیں۔ پارلیمانی نظام کے برعکس اس میں مقننہ اور عاملہ کا دائرہ کار جداگانہ ہوتے ہیں اور تقسیم اختیارات پر عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ عدلیہ کے پاس عدالتی نظرثانی کے وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ صدر کو کابینہ کی تشکیل اس میں تبدیلی اور کسی وزیر کو اس کے عہدے سے برطرف کرنے کا کلی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ عموماصدر کی مدت یا معیاد 4 یا بعض ممالک میں 5 برس ہوتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا اس طرز جمہوریت کی بہترین مثال ہے۔

جمہوریت اور انسانی ارتقاء

یونانی کلاسیکل فلسفے سے لے کر موجودہ دور تک کے مصنفین نے عام طور پر یہ سمجھا ہے کہ جمہوری ادارے کسی بھی معاشرے کے محروم طبقات کی ضروریات اور مفادات کی حمایت میں ایک سیاسی فضا ہموار کرتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل بڑی حد تک اس خیال پر مرکوز ہے کہ جمہوری حکومت عام لوگوں بالخصوص غریب شہریوں کو بااختیار بناتی ہے، جس کے نتیجے میں حکومتیں ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے جوابدہ ہوتی ہیں۔ ارسطو، میڈسن، اور بعد کے بیشتر سیاسی ماہرین کے مطابق یہ بات مسلم ہے کہ جمہوریت اختیارات کی تقسیم در تقسیم کے طریقہ کار کے طور پر کام کرتی ہے۔ حالیہ دور میں یہ نظریہ کسی حد تک چیلنج ہوا ہے کیونکہ بہت سے محققین کے خیال میں جمہوری حکومتوں کے مقابلے میں ان ملکوں میں زیادہ انسانی ترقی ہوئی ہے جہاں آمرانہ حکومتیں قائم رہی ہیں جبکہ جمہوری حکومتوں میں بہت زیادہ غربت اور محرومیاں دیکھی گئی ہیں۔ اس دعوے کی حمایت اور مخالفت میں دلائل ایک طویل بحث کا تقاضا کرتے ہیں۔

تاہم یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی بھی ریاست میں حکومت کی ایک جمہوری شکل کو طویل عرصے تک برقرار رکھا جاتا ہے، تو اس طرزِ حکومت کا اثر اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لئے مثبت ثابت ہوگا۔ اس لیے محققین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سیاسی اداروں کے اثرات وقت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو ان کے اثرات کے لیے ایک بڑا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تاہم یہ اثرات معاشرے میں مجموعی سطح پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ درج ذیل چار اہم نکات کی وجہ سے جمہوریت اور انسانی ترقی کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے جس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مابین ایک طویل عرصے سے باہمی تعلق استوار ہے۔

پہلی بات یہ کہ ووٹرز کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سیاسی اشرافیہ کے مابین مسابقت ایک ایسی صورتحال پیدا کرے گی جس میں اشرافیہ کم سے کم ووٹرز کی اکثریت حاصل کرنے کے لیے بھی شہریوں کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ چونکہ ایک بڑے پیمانے پر انسانی پریشانی حکمرانوں کو غیر مقبول کر دیتی ہے اس لیے جمہوری طریقے سے منتخب رہنماؤں کو انسانی ترقی کے امور کے بارے میں زیادہ تشویش لاحق ہو سکتی ہے بانسبت ایسے رہنماؤں کے جو دیگر طریقوں سے اقتدار میں آتے ہیں۔ آمرانہ حکومتیں اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے عوام اور اشرافیہ کو خوش رکھتی ہیں مگر ان کی جانب سے جمہوری اقدار پر بے جا پابندیاں فساد اور افراتفری کی طرف لے جاتی ہیں۔ جیسا کہ عرب بہار میں نوجوانوں کی تحریکوں نے کئی سالوں پر محیط اپنی حکومتوں کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔

دوسرا جمہوری ادارے ایک بہتر ترقی یافتہ سول سوسائٹی کو فروغ دینے میں مائل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی حقوق اور شہری حقوق کا باہمی تعلق ہے اور عام طور پر شہری حقوق کی موجودگی وقت گزرنے کے ساتھ رضاکارانہ تنظیموں کے بڑے نیٹ ورک کے قیام کا سبب بنتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ رضاکارانہ تنظیمیں سرکاری یا بین الاقوامی اداروں کے ساتھ مل کر اکثر غریبوں کے لئے خدمات فراہم کرنے میں معاون

ہوتی ہیں اور محروم طبقات کی بہتری کے لیے قانون سازی کی لابنگ میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں جو ان کی ضروریات کو حل کرتے ہیں اور عوامی انتظامیہ کے معیار کو بہتر بناتے ہیں۔

تیسرا، جمہوریت مساوات کے ایسے کلچر کے فروغ میں معاون ثابت ہو سکتی ہے جو مظلوموں کو تقویت بخشتا ہے۔ تمام دیگر طبقات مثلاً نچلی ذاتیں، طبقات، کسان، نسلی اور مذہبی اقلیت وغیرہ کو باضابطہ شہریت کے حقوق دینے کے عمل میں جمہوریت ایک ایسی سیاسی فضا کو فروغ دے سکتی ہے جس میں یہ گروہ اپنے مفادات کا بطور حقوق تصور کرتے ہوئے سیاسی، معاشرتی اور معاشی شعبوں میں خیال رکھ سکیں گے۔ یہ سیاسی عمل اگر جاری رہے تو انسانی ترقی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے سرکاری اداروں کی کارکردگی میں توسیع اور بہتری ممکن ہو گی۔ البتہ یہ سمجھنا مناسب ہے کہ اس عمل سے عام طور پر ہونے والی تبدیلی صدیوں نہیں بلکہ صرف دہائیوں کے عرصے میں واقع ہو گی۔

آخر میں، ہم توقع کرتے ہیں کہ پرانی جمہوری ریاستیں زیادہ سے زیادہ سیاسی ادارہ سازی سے فائدہ اٹھائیں گی۔ اگرچہ سیاسی ادارہ سازی کی وضاحت کرنا مشکل ہے، لیکن عام اتفاق رائے یہ ہے کہ ادارہ جاتی طرز عمل میں عملی طور پر ایک بہترین فرق لایا جائے، انہیں باقاعدہ، پیشہ ورانہ اور منطقی طور پر قابل عمل بنایا جائے۔

دوسری جانب جب ہم انسانی ترقی کی بات کرتے ہیں تو ماہرین اس میں غربت کا خاتمہ، بچوں کی صحت، اور معاشی ترقی بھی شامل کرتے ہیں۔ کسی بھی ملک میں انسانی ترقی کا معیار ماپنے کے لیے وہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مشترکہ اشاریے جیسے ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس (ایچ ڈی آئی)، مختلف اشاریے جمع کرتے ہیں جن میں شرح اموات، تعلیم اور آمدنی (فی کس جی ڈی پی)، یا زندگی کے طبعی معیار کا اشاریہ (پی کیو ایل آئی)، جو اموات اور تعلیم کے اشاریے کو جوڑتا ہے۔

اس لیے مختلف تحقیقی مقالہ جات میں ہیومن ڈیویلپمنٹ یا انسانی ترقی کے اشاریوں کو جمہوریت کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں شہریوں کی زندگی اور معاش میں نمایاں بہتری کو اس ملک کی حکمرانی کی تاریخ میں پرکھا جاتا ہے نہ کہ اس کی موجودہ حیثیت سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ معاشرے نے کس حد تک ترقی حاصل کی ہے۔ طویل المیعاد جمہوریتیں سیاسی مسابقت سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر احتساب کا نظام، مضبوط سول سوسائٹی جو انسانی ترقی، سماجی اقدار اور مساوات پر زور دیتی ہیں، اور آمرانہ حکمتوں یا نئی جمہوریتوں کے مقابلہ میں اعلیٰ سطح کی ادارہ سازی کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔

اس لیے ترقی پذیر ممالک کو انسانی ترقی کی سطح کو بہتر بنانے کی لیے بہت زیادہ اہلیت درکار ہے۔ حقیقت پسندانہ طور پر، جمہوری نظام کے نتیجے میں ترقی پذیر ممالک کو انسانی ترقی کے معیار میں فوری طور پر بڑے فائدہ کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ دوسری طرف جمہوریت کو بھی معاشرے میں پسماندہ طبقوں کے لئے اہم اور ٹھوس فوائد حاصل کرنے کے لیے وقت دینا چاہیے۔ اس دنیا میں۔ جو مختصر مدت میں تبدیلی سے دوچار رہتی ہے، سب سے بڑا سیاسی چیلنج ہی یہی ہے کہ جمہوری اداروں کو فوائد کا ادراک کرنے کے لئے وقت درکار ہے۔

جمہوریت کی خوبیاں

(Merits of Democracy)

جمہوریت نے دنیا کے قدیم سیاسی نظاموں میں مؤثر تبدیلیاں لائیں۔ پرامن انتقال اقتدار سمیت کئی اہم امور کو جمہوریت کی خوبی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں چند مختصر اور عمومی خوبیوں کا تذکرہ ہے، لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ جمہوریت میں کوئی خامی نہیں۔ لیکن جمہوریت میں پرامن تبدیلی اور خامیوں کو دور کرنے کی ہر وقت گنجائش موجود رہتی ہے۔

فلاح عامہ

جمہوری حکومت دیگر حکومتوں کے مقابلے میں عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ اس نظام میں کسی مراعات یافتہ طبقے کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک طرح کی فلاحی مملکت (Welfare State) ہوتی ہے۔ جمہوریت عوام کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے حقوق سے بہتر طور پر فائدہ اٹھائیں اور اجتماعی خوشحالی سے ہمکنار ہوں۔ جمہوریت کی بدولت ہی زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

حکومت میں شرکت کا احساس

جمہوریت کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ عوام کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے سے کاروبار حکومت میں شریک ہیں۔ اس لئے وہ مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین اور حکومت کے فیصلوں کی پابندی کرتے ہیں اور ملک کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ عوام کے نمائندے ان کی مرضی کے مطابق حکومت چلاتے ہیں اور جو نمائندے منتخب ہوتے ہیں وہ انھی میں سے ہوتے ہیں۔ جمہوریت میں لوگوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ حکومت ان کی بنائی ہوئی ہے، اس لیے ہر شخص اپنے فرائض ذمہ داری اور تندہی سے سرانجام دیتا ہے۔

اخلاقی بہبود

جمہوریت عوام کے اخلاق کو بلند کرتی ہے۔ انھیں انسان دوستی، شرافت، باہمی ایثار اور محبت کے اصول سکھاتی ہے۔ اس لیے اس نظام کو اخلاقی افادیت کی بنا پر بھی پسند کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ بہتر حکومت وہ ہے جو فرد کی شخصیت کو فروغ دینے میں مددگار ہو۔ جمہوری حکومت اس کا بہتر انتظام کرتی ہے۔

حقوق کا تحفظ

جمہوریت میں عوام کے حقوق مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔ عوام کے منتخب نمائندے پارلیمینٹ میں ہوتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا قانون نہیں بناتے جو عوام کے حقوق کے منافی ہو۔ اور نہ ہی حکومت کو ایسے اقدامات اٹھانے دیتے ہیں جن سے عوام کے حقوق غصب ہونے کا خطرہ ہو۔

امن پسند

جمہوری نظام میں ملک گیری کی ہوس کم ہوتی ہے۔ اس میں حکومت امن پسند ہوتی ہے، کیونکہ یہ عوام کی مرضی پر انحصار کرتی ہے۔ عوام بخوبی جانتے ہیں کہ جنگ کی صورت میں وہ ہی سب سے زیادہ نقصان اٹھائیں گے۔ اگرچہ بعض اوقات بڑی طاقتیں ''امن پسند'' نہیں رہتی۔

حب الوطنی

اس طرح کی حکومت میں عوام امورِ حکومت میں بذات خود حصہ لیتے ہیں اور عوام کی حکومت کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت اور ملک کے وہ خود مالک ہیں اور یہ احساس ان میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

ہر دل عزیز

چونکہ یہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق چلتی ہے۔ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ قانون عوامی نمائندے وضع کرتے ہیں اور وہی نافذ کرتے ہیں۔ لہذا یہ طرز حکومت ہر دل عزیز قرار دیا جاتا ہے۔

انسان دوستی

اکثر و بیش تر کسی آمر یا بادشاہ کی نظر میں انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہ ہر جائز تنقید کرنے والے کو بھی کچل دیتا ہے، لیکن جمہوریت میں ایسا ممکن نہیں۔ وہ انسان دوستی کا بھرم رکھتی ہے اور ہر تنقید کو کھلے دل سے برداشت کرتی ہے۔

مساوات

مساوات جمہوریت کا بنیادی ستون ہے۔ جمہوریت آزادی اور مساوات کی علم بردار ہوتی ہے۔ اس میں ہر شخص یکساں سیاسی حقوق کا مالک ہے۔ ہر شخص کو ترقی کے مساوی مواقع ملتے ہیں اور کسی کے ساتھ خصوصی اور امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ عدالتیں شہریوں کے بنیادی حقوق کی محافظ ہوتی ہیں۔

انقلاب سے تحفظ

جمہوریت میں بغاوت اور انقلاب کا خدشہ کم رہتا ہے، کیونکہ یہ پرامن ترغیب اور تحریک پر اعتقاد رکھتی ہے۔ عوام جانتے ہیں کہ اس نظام میں حکومت کو تبدیل کرنے کے لیے آئینی اور پرامن ذرائع موجود ہوتے ہیں، جس کا استعمال انتخاب کے موقع پر باآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے جمہوری حکومتیں اکثر انقلاب سے محفوظ رہتی ہیں۔ بشرطیکہ ان حکومتوں میں حقیقی جمہوریت موجود ہو۔

جوابدہی کا تصور

جمہوریت میں ہر سطح پر جوابدہی کا تصور پایا جاتا ہے جس کے باعث حکمرانوں کے اختیارات کے ناجائز استعمال کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ پارلیمینٹ کے نمائندے عوام کے روبرو اور پارلیمانی حکومت پارلیمینٹ کے روبرو جوابدہ ہوتی ہے۔ اگر منتخب نمائندے عوام کی منشاء اور اپنے وعدوں کے مطابق قانون سازی نہیں کرتے تو اگلے انتخابات میں عوام ان کو مسترد کر دینگے۔ اسی طرح پارلیمینٹ میں حزب اختلاف برسراقتدار جماعت کا احتساب کرتی ہے اس سے کابینہ کے ارکان مستعد رہتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو عوام کے مفادات کے خلاف ہو۔ جوابدہی کا یہ تصور جمہوریت میں اپنی مثال آپ ہے۔

سیاسی شعور میں اضافہ

یہ نظام عوام میں سیاسی شعور اجاگر کرتا ہے۔ اس طرزِ حکومت میں انتخابات کثرت اور باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ انتخابات کے وقت ہر سیاسی جماعت ملکی مسائل اور ان کے حل کے لیے تجاویز پیش کرتی ہے، جس سے عوام کی سیاسی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے۔

جمہوری حکومتوں میں مذکورہ صفات اور خوبیاں اسی صورت میں ہو سکتی ہیں جب جمہوریت پر اس کی روح کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر جمہوریت پر اس کی روح کے مطابق عمل نہیں ہوتا تو یہ نظام فلاحی مملکت، اور عوامی حکومت بنانے اور انسان دوستی، ایثار و قربانی، امن پسندی، حب الوطنی اور مساوات کو فروغ دینے میں ناکام ہوتا ہے اور پے در پے انقلابات سے روبہ زوال ہوتا ہے۔

اسی لیے جہاں ایک طرف جمہوریت کی خوبیاں موجود ہیں وہیں پر ناقدین نے اس کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

- ناقدین کا خیال ہے کہ عوام کی بہت کم تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ یا سیاسی سوجھ بوجھ کی حامل ہوتی ہے۔ اکثر جاہل اور کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ایسے افراد سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ بہترین اور اہل نمائندے منتخب کر لیں گے۔ اس لئے عنان حکومت بھی ایسے افراد کو مل جاتی ہے جو جاہل اور کند ذہن ہوتے ہیں۔
- عوام کو نمائندے منتخب کرنے کا اختیار ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن اگر یہ نمائندے عوام کی منشاء کو نظرانداز کر دیں تو عوام پانچ سال سے قبل ان کا احتساب نہیں کر سکتے۔
- یہ طرزِ حکومت نہایت سست اور غیر مستحکم ہے۔ اس میں حکومت کے تمام فیصلے اور قانون سازی بحث و تمحیص اور صلاح مشورے سے ہوتے ہیں۔ اس سے وقت کا بہت ضیاع ہوتا ہے اس لئے اسے سست حکومت کہا جاتا ہے۔

- اس نظام میں بار بار انتخاب، پروپیگنڈہ، جلسے جلوس اور انتخابی مہم پر بے جا اخراجات آتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں تو فنڈ حاصل کر کے پورا کر سکتی ہیں لیکن اوسط درجے کا امیدوار ان اخراجات کو پورا نہیں کر سکتا۔
- جمہوریت میں سیاسی جماعتیں انتخاب جیتنے کیلئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ اور جو افراد منتخب ہو جاتے ہیں وہ مختلف طریقوں سے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی سیاسی جماعت کو پارلیمینٹ میں اکثریت حاصل نہ ہو تو دوسرے اراکین کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے ان کو عہدے سیاسی رشوت کے طور پر دیے جاتے ہیں۔
- اس نظام میں قوم کو مختلف جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کو عوام کی نظروں سے گرانے کیلئے ہر قسم کے حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ برسرِ اقتدار جماعت قومی مفاد کے بجائے جماعتی مفاد میں فیصلے کرتی ہے اس طرح قوم نہ صرف مختلف گروہوں میں تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ ملک کی بقاء اور سلامتی کو خطرے لاحق ہو جاتے ہیں۔

ان تمام خامیوں کی اصلاح ممکن ہے، مگر جمہوری نظام سے بڑھ کر اب تک کوئی ایسا نظام یا طرزِ حکومت اس وقت رائج نہیں جسے رول ماڈل کے طور پر اپنایا جا سکے۔

فصل دوم:

جمہوری اقدار اور اسلامی تعلیمات

جمہوری اقدار جمہوری معاشرے کا انتہائی اہم حصہ ہے۔ دین اسلام نے جہاں انفرادی طور پر انسان کے لئے اخلاقی نظام تشکیل دیا ہے وہاں پر اجتماعی اور حکومتی سطح پر اقدار، اخلاق اور حسن کردار کی تعلیم دی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے آج سے کئی سو سال پہلے اپنی تعلیمات میں مسلمانوں کو ان اقدار کے اپنانے کا حکم فرمایا تھا۔ اس لئے موجودہ سیاسی سیٹ اپ میں اس کی اہمیت مزید بڑھتی جا رہی ہے، لہذا چند اہم جمہوری اقدار حسب ذیل ہیں:

اجتماعی بھلائی

شہریوں کو مجموعی طور پر معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہیے اور حکومت کو ایسے قوانین بنانا چاہیے جو سب کے لیے فائدہ مند ہوں۔ عوامی یا اجتماعی بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ ہر شہری یہ عزم کرے کہ وہ اپنی قومی ذمہ داری پوری کرے گا۔ معاشرے کی فلاح و بہبود کو فروغ دینے اور تمام لوگوں کے مجموعی مفاد کے لیے معاشرے کے دیگر ارکان کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ اسلامی تعلیمات میں بہت واضح طور پر انسانیت کی بھلائی پر زور دیا گیا ہے۔ خدمت خلق انسانی اقدار کی بلند ترین صفات میں سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

: خیر الناس من ینفع الناس (الحدیث) لوگوں میں بہترین وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو نفع دے۔ جب ہم خدمت خلق کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے صرف مسلمانوں کی یا انسانوں کی خدمت ہی مراد نہیں ہوتی بلکہ پوری خلق خدا کی عبادت اس میں شامل ہے۔ اسلام میں خدمت کا نہایت وسیع تصور ہے۔

انصاف

اپنے ملک اور رعایا میں سب کے ساتھ منصفانہ سلوک اختیار کرنا چاہیے، کسی گروہ یا شخص کو فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ مراعات، حیثیت و مرتبہ، حقوق و فرائض اور فوائد کی تقسیم میں، معلومات کے اکٹھا کرنے اور فیصلہ سازی میں سب لوگوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جانا چاہیے۔ قانون کے تحت تمام شہریوں کو برابر اور منصفانہ سلوک کا حق حاصل ہے۔ قران پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے متعدد مقام پر عدل وانصاف کا حکم دیا ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۚ (سورۃ النساء)

اور جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۚ (المائدہ: ۴۲)

بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ

اے ایمان والو! اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ، چاہے تمہارے اپنے یا والدین یا رشتے داروں کے خلاف ہی (گواہی) ہو۔ جس پر گواہی دو وہ غنی ہو یا فقیر بہر حال اللہ ان کے زیادہ قریب ہے تو (نفس کی) خواہش کے پیچھے نہ چلو کہ عدل نہ کرو۔ (النسآء: ۱۳۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو حق دینے میں ہمیشہ انصاف سے کام لیا۔ ایک بار ارشاد فرمایا: ''تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب اُن میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے لیکن جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ اللہ کی قسم! محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔ (صحیح بخاری و مسلم) یہ ہے انصاف کا وہ عالی قدر نمونہ کہ اگر مجرم اپنی اولاد بھی ہو تو اسے معاف نہ کیا جائے!

حضرت سیّدُنا ابو ہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہ بیان کرتے ہیں کہ حضور پُر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: عادل حکمران کا اپنی رعایا میں ایک دن کام کرنا عابد کے اپنے اہل میں 50 یا 100 سال کام کرنے سے افضل ہے۔ رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ایک گھڑی کا عدل 70 سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت سیّدُنا ابو ہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہ بیان کرتے ہیں کہ سَیِّدِ عالم، نُورِ مُجَسَّم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تین شخصوں کی دعا رد نہیں ہوتی: (۱) عادل بادشاہ (۲) روزہ دار جب افطار کرے اور (۳) مظلوم کی دعا۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کی دعا بادلوں سے اوپر اُٹھاتا ہے اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیتا ہے۔

کسی گورنر نے حضرت سیّدُنا عمر بن عبد العزیز عَلَیْہِ رَحْمَۃُ اللہِ العَزِیْز کو خط لکھا اور شہر کی خستہ حالی کی شکایت کی اور کچھ مال طلب کیا تو آپ رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہ نے ان کو جواب لکھا: میں تمہارے خط کو سمجھ گیا ہوں لہٰذا جب تم میرا یہ خط پڑھو تو اپنے شہر کو عدل کے ذریعے مضبوط کرو اور اس کے راستے ظلم سے پاک وصاف کر دو یہی اس کی تعمیر ہے۔

آزادی

آزادی کے حق کو انسانی فطرت کے ایک ناقابل تبدیل پہلو کے طور پر مانا جاتا ہے۔ آزادی کا تصور یہ ہے کہ لوگ اپنے والدین یا آباؤاجداد کی سیاسی یا ذاتی ذمہ داریوں کے پابند نہیں ہیں اور نہ ہی لوگوں کو قانونی طور پر ان کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ آزادی کے حق میں **شخصی آزادی** بھی شامل ہے۔ اس میں لوگوں کے نجی دائرے شامل ہیں جس میں ہر شخص سوچنے، کام کرنے کے لیے آزاد ہے اور حکومت قانونی طور بھی ان میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ **سیاسی آزادی** ہے جس میں سیاسی عمل میں آزادانہ طور پر حصہ لینے، سرکاری حکام کو منتخب کرنے اور باہر نکالنے کا حق، قانون کی حکمرانی کے تحت حکومت کرنے کا حق، معلومات اور خیالات کے آزاد بہاؤ کا حق، بحث اور اجتماع کا حق شامل ہیں۔ **اقتصادی آزادی**: جس میں حکومتی مداخلت کے بغیر نجی جائیداد حاصل کرنے، استعمال کرنے، منتقل اور تصرف کرنے کا حق، جہاں پر آپ راضی ہوں وہاں روزگار طلب کرنے کا حق، اپنی مرضی سے روزگار کو تبدیل کرنے اور کسی بھی قانونی معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کا حق شامل ہے۔ آزادی کا مطلب ہے کہ آپ جو چاہتے ہیں اس پر ایمان لانے کی آزادی ہو، آپ کو اپنے دوست منتخب کرنے کی آزادی ہو، آپ کو اپنے خیالات اور رائے رکھنے کی آزادی اور عوام میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی آزادی ہو، لوگوں کو ایک گروپ کی صورت میں اکٹھا ہونے کی آزادی ہو، اور کسی بھی جائز کام/روزگار یا کاروبار کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہر چیز کے خالق، مالک، خوب قدرت وعلم رکھنے والی ذات باری تعالٰی نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ وہ اس کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزادی دلائیں :قرآن مجید میں ہے: (حضرت موسٰیؑ نے یہ کہا) کہ اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو تمھاری طرف (خدا کا) پیغمبر (ہو کر آیا) ہوں دیانت دار ہوں۔ کہنے لگے، "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، میں تمھاری طرف ایک امانت دار پیغمبر بن کر آیا ہوں" (سورۃ الدخان: 18) یعنی خدا کے بندوں کو اپنا بندہ مت بناؤ۔ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزادی دو اور میرے حوالہ کرو۔ میں جہاں چاہوں لے جاؤں۔

خلافتِ راشدہ میں اِظہارِ رائے کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبہ جمعہ کے دوران ایک شخص نے کھڑے ہو کر آپ سے اِعتراض کیا کہ وہ آپ کے خطبہ کو اُس وقت تک نہیں سنیں گے جب تک کہ وہ اپنے کرتے کے لیے بیت المال سے زیادہ کپڑا لینے پر جواز فراہم نہ کر دیں، پس اُنہوں نے اُس بات کا برا ماننے کی بجائے بھری مجلس میں ہونے والے اِس سوال کی وضاحت پیش کی۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواتین کے حقِ مہر کی مقدار کے تعین کا اِرادہ کیا تو ایک خاتون نے آپ کے اُس فیصلے پر اِعتراض کیا اور قرآنِ مجید کی دلیل سے آپ کو ایسا فیصلہ کرنے سے روک دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِعتراض کرنے والی خاتون کی دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے نہ صرف اپنا فیصلہ واپس لیا بلکہ اُس کا شکریہ اَدا کیا کہ اُس نے اُنہیں ایک غلطی سے بچا لیا۔ (الاحکام لابن حزم، 2:245،244)

مقبول اور مکمل خود مختاری

حکومت کی طاقت عوام سے آتی ہے۔ اس لیے عوام کی طاقت سے بر سر اقتدار آنے والی حکومت زیادہ طاقتور اور خود مختار ہوتی ہے۔ جمہوریت میں اکثریت کی بنیاد پر حکومت بنتی ہے اور یہی اکثریت مفاد عامہ کے لیے قوانین بناتی ہے۔ امریکا کا صدر ہو یا ہمارے ملک کا وزیر اعظم، یہ تمام عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ اس لیے ایک جمہوری معاشرے میں ''شہری'' حکومت کی طاقت کا اہم ذریعہ ہیں۔

اسلام نے مسلمان حکمرانوں کی اس صفت کو تسلیم کیا، قرآن پاک میں ہے۔

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ''اور اُن کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔'' القرآن، الشوریٰ، 38:42

زندگی کی اہمیت

ایک جمہوری معاشرے میں ہر شخص کو اس کا یا اس کی زندگی کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ تمام شہری حکومت کی طرف سے یا کسی اور فرد یا گروہ کی جانب سے زخمی ہونے یا موت کے خوف کے بغیر جینے کا حق رکھتے ہیں۔ ریاست ہر شہری کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ اسلام میں کسی انسانی جان کی قدر و قیمت اور حرمت کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے بغیر کسی وجہ کے ایک فرد کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تکریم انسانیت کے حوالے سے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی شخص کو بغیر قصاص کے یا زمین میں فساد (پھیلانے کی سزا) کے (بغیر، ناحق) قتل کر دیا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا''۔ (المائدۃ، 32)۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا فَلَا يُسۡرِفۡ فِّى الۡقَتۡلِ ؕ

اور کوئی جان جس کی حرمت اللہ نے رکھی ہے ناحق نہ مارو اور جو ناحق مارا جائے تو بے شک ہم نے اس کے وارث کو قابو دیا ہے تو وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے۔

فرمانِ مصطفےٰ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلم ہے: اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری کائنات کا ختم ہو جانا کسی شخص کے ناحق قتل ہو جانے سے زیادہ ہلکا ہے۔ (موسوعہ ابن ابی الدنیا، ج6، ص234، حدیث: 231)

ارشاد ہوتا ہے: سب سے بڑے گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، کسی جان کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا ہیں۔ (بخاری، ج4، ص357، حدیث: 6871)

رسول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خون بہانے کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ (مسلم، ص711، حدیث: 4381)

نبی پاک صلّی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلم نے مسلمان کی جان کی حُرمت کو کعبے کی حرمت سے زیادہ محترم قرار دیا ہے۔ (ابن ماجہ، ج4، ص319، حدیث: 3932 ملخصاً)

مساوات

جمہوریت میں سب افراد کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ آپ کے والدین یا آباؤاجداد کہاں پیدا ہوئے تھے، آپ کی نسل، مذہب یا کتنی دولت آپ کے پاس ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر سب لوگوں کو مساوات حاصل ہے۔ ایک جمہوری ریاست میں تمام شہریوں کو **سیاسی مساوات** حاصل ہے اور تمام لوگ سیاسی معاملات میں حصہ لے سکتے ہیں۔ **قانونی مساوات** کی رو سے قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہیں۔ **سماجی مساوات** میں ہر قسم کی طبقاتی تقسیم ممنوع قرار دی گئی گئی۔ **معاشی مساوات** دیگر سیاسی اور سماجی مساوات کو مضبوط کرنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا کہ: ''کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر سوائے تقوی کے''۔ (مسند احمد: ۴۳۵۳۶)

تنوع

زبان، لباس، خوراک، جائے پیدائش، نسل اور مذہب میں اختلافات کی نہ صرف اجازت دی گئی، بلکہ اسے قبول بھی کر لیا گیا ہے۔ ثقافت، نسلی پس منظر، طرز زندگی، اور مذاہب میں رنگا رنگی اور تکثیریت نہ صرف جائز بلکہ ایک حقیقت بن چکی ہے۔ تکثیریت پر مبنی معاشرے میں ثقافت، لباس، زبان، مذہب وغیرہ میں فرق کو ایک طاقت کے طور پر مانا جاتا ہے۔ فقہ اسلامی میں فقہ الاقلیات کا بھرپور ذخیرہ موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ ماضی میں اسلامی حکمرانوں نے ایک خاص انداز میں تکثیریت کو قبول کیا تھا۔ کائنات میں رنگا رنگی اور تنوع خود خالق کائنات کی تخلیق ہے اور حکمت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اور وہ جو تمہارے لیے زمین میں پیدا کیا رنگ برنگ بیشک اس میں نشانی ہے یاد کرنے والوں کو۔ النحل: 13

اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھارے خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں، تاکہ تمھیں آپس میں پہچان ہو۔ الحجرات: 13

اور آدمیوں اور جانوروں اور چارپایوں کے رنگ یونہی طرح طرح کے ہیں، اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، بے شک اللہ عزت والا بخشنے والا۔ الفاطر: 28

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف، بے شک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے۔الروم:22

خوشی کا حصول

ہر شخص اپنے طریقے سے خوشی حاصل کر سکتا ہے جب تک کہ وہ دوسروں کے حقوق پامال نہ کرے۔آپ دوسروں کے حقوق اور معاملات کو پامال کئے بغیر اپنے طریقے سے خوشی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔جو خوشی دوسروں کے لیے وبال جان ہو اس کی اجازت نہیں۔قرآن و حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کو بھی اپنے بندوں کی خوشی عزیز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 170) کہ جنتی لوگ خوش ہوں گے، ان نعمتوں پر جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔ایک اور جگہ فرمایا۔

اور یہ فتح اللہ نے نہ کی مگر تمہاری خوشی کے لئے اور اسی لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو چین ملے اور مدد نہیں مگر اللہ غالب حکمت والے کے پاس سے۔آل عمران:126

ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً بِسَاعَةٍ کہ دلوں کو وقتاً فوقتاً خوش کرتے رہا کرو۔(مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 672)

حقیقت یا سچ

شہری حکومت سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ تمام معلومات کو ظاہر کرے اور حقائق کا مکمل انکشاف کرے یعنی جھوٹ سے اور حقائق چھپانے سے گریز کرے، عوام اور حکومت کے درمیان اعتماد سازی ایک جمہوری حکومت کا لازمی جزو ہے، جھوٹ اور معلومات کو پوشیدہ رکھنا اسلام اور جمہوری یا سیاسی اقدار کے خلاف ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوا: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور (ہمیشہ) سچوں کے ساتھ رہو''۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''عبداللہؓ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ سچائی کو اختیار کرو، کیونکہ سچائی خدا کی وفاداری کی راہ پر لے جاتی ہے اور خدا کی وفاداری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی نافرمانی دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے (صحیح البخاری: 6094)۔

امام ابو حامد محمد الغزالیؒ ''احیاء العلوم'' میں صدق کی اقسام، معانی اور مراتب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لفظ صدق کا اطلاق چھ معانی پر ہوتا ہے:

قول میں صداقت، نیت میں صداقت، ارادے میں صداقت، عزم میں صداقت، عزم پورا کرنے میں صداقت، عمل میں صداقت اور دین کے تمام مقامات کی تحقیق میں صداقت۔اور جو شخص ان چھ معانی میں صدق کے ساتھ متصف ہو وہ صدیق ہے اس لیے کہ لفظ صدیق صدق سے مبالغے پر دلالت کرتا ہے۔

وطن کی محبت

قول و عمل میں میں اپنے ملک سے اور جمہوری اقدار سے محبت کا ہونا لازمی ہے۔اپنے ملک، اپنی اقدار، اور اصولوں سے محبت اور عقیدت کا اظہار حب الوطنی ہے۔ کھیلوں کی تقریب کے آغاز میں قومی ترانے کے دوران کھڑے ہونا حب الوطنی دکھانے کا ایک طریقہ ہے۔ حب الوطنی کے حوالے سے بہت سی اسلامی تعلیمات موجود ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شہر مکہ کو امن کا گہوارہ بنانے کی دعا کرنا در حقیقت اس حرمت والے شہر سے محبت کی علامت ہے۔ قرآن فرماتا ہے: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ o ابراھیم، 35:14

اور (یاد کیجیے) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو جائے امن بنادے اور مجھے اور میرے بچوں کو اس (بات) سے بچالے کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔

اپنی اولاد کو مکہ مکرمہ میں چھوڑنے کا مقصد بھی اپنے محبوب شہر کی آبادکاری تھا۔انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ لا رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ o ابراھیم، 37:14

اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی اولاد (اسماعیل علیہ السلام) کو (مکہ کی) بے آب و گیاہ وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم رکھیں پس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ وہ شوق و محبت کے ساتھ ان کی طرف مائل رہیں اور انہیں (ہر طرح کے) پھلوں کا رزق عطا فرما، تاکہ وہ شکر بجالاتے رہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكِ إِلَيَّ، وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ۔ سنن الترمذی، 5:723، رقم:3926، صحیح ابن حبان، 9:23، رقم:3709، المعجم الکبیر للطبرانی، 10:270، رقم:10633

تُو کتنا پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کتنا محبوب ہے! اگر میری قوم تجھ سے نکلنے پر مجھے مجبور نہ کرتی تو میں تیرے سوا کہیں اور سکونت اختیار نہ کرتا۔

اس طرح ایک اور روایت سے بھی نبی کریم ﷺ کی حب الوطنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔جب آپ ﷺ نے مدینہ کو اپنا وطن و مسکن بنالیا تو چونکہ آپ ﷺ کی مکہ مکرمہ سے فطری و جبلی محبت تھی، اس لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کی: ''اے پروردگار! مدینہ کو ہمارے نزدیک محبوب بنادے۔ جس طرح ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت پیدا فرما۔'' (البخاری:1889)

قانون کی حکمرانی

دستور ان کا جو ہم نے تم سے پہلے رسول بھیجے اور تم ہمارا قانون بدلتا نہ پاؤ گے۔ بنی اسرائیل:77

حکومت اور عوام دونوں کے لیے قانون پر عمل کرنا ضروری ہے۔ قانون کی حکمرانی جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے اہم ہے۔ارشاد باری تعالی ہے: وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (البقرۃ:229)"اور جو لوگ اللہ کی حدود سے باہر نکل جائیں گے، وہ گناہ گار ہوں گے"۔اسی وجہ سے فقہانے ایک عمومی قاعدہ وضع کیا کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم نہ آتی ہو، ان میں حکومتِ وقت کے حکم کو ماننا فرض ہے۔(فتاویٰ شامی،422/5)

باب دوم: ریاست اور اس کے عناصر

سیاسیات کے علم اور اصطلاحات میں لفظ ریاست کی مختلف تعریفیں ملتی ہیں مگر ان تعریفوں میں تین عناصر مشترک ہیں۔ پہلا عنصر **لوگ یا عوام** ہیں یعنی کوئی بھی ریاست لوگوں کے بغیر تشکیل نہیں پاسکتی یعنی اگر کسی جگہ انسان ہی موجود نہیں تو وہاں ریاست کی موجودگی اور عدم موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا عنصر یا شرط حکومت یا سیاسی تنظیم ہے یعنی جو لوگ موجود ہوں ان میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کے ایک طریقہ کار پر اتفاق ہو جو تمام ریاستوں میں آئین فراہم کرتا ہے چاہے وہ تحریری ہو یا غیر تحریری۔ جب ہم آئین کے تقدس کی بات کرتے ہیں تو اس کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ اگر آئین سبوتاژ ہو گا تو ریاست اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ تیسرا عنصر علاقہ ہے جسے موجودہ ریاستی نظام میں بہت زیادہ اہمیت حاسل ہے کیونکہ ہر ریاست کی ایک سرحد ہے اور اس کے بعد ہی دوسری ریاست کا علاقہ شروع ہو سکتا ہے لیکن اگر کسی ریاست کے پاس علاقہ ہی نہ ہو تو اسے ریاست کا درجہ نہیں مل سکتا۔ اگر ہم مزید آگے بڑھیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ کسی بھی ریاست کا دوسری ریاستوں کی طرف سے تسلیم کیا جانا بھی ضروری ہے اور اس کے بعد ہی کوئی ریاست کا اپنا کاروبار عالمی برادری میں چلا سکتی ہے۔ پاکستان اسرائیل کو بطور ریاست تسلیم نہیں کرتا مگر کئی عرب ملکوں سمیت باقی دنیا اسے تسلیم کرتی ہے لہٰذا اسرائیل بطور ریاست موجود ہے چاہے ہم اس کے قیام کو جتنا بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی سمجھتے رہیں۔

بعض اوقات ریاست اور حکومت کو ایک ہی معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے حکومت کی تعریف کے بارے میں بھی جاننا ضروری ہے۔

حکومت کا مفہوم

حکومت کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک تعریف کے مطابق: "حکومت سیاسی کنٹرول کا ایسا نظام ہے جس کے تحت قانون بنانے اور نافذ کرنے کا حق آزاد سیاسی معاشرے میں مخصوص افراد کو ہوتا ہے"۔ اسی طرح دوسری تعریف کے مطابق: ''حکومت جمہوری ریاست میں منتخب افراد کی ایسی تنظیم ہے، جو آئین کے مطابق عوام کی اجتماعی ترقی کے لیے پالیسی کو نافذ کرتی ہے''۔ مثلاً برطانیہ میں پارلیمانی حکومت۔ ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ: "حکومت سے مراد ایسا اقتدار اعلی ہے جو ایک ریاست میں یا ایک آزاد سیاسی معاشرے میں ایک یا چند منتخب افراد کی

طرف سے برتر سیاسی حیثیت میں استعمال کیا جاتا ہے اور حکومت کا یہ اعلیٰ اختیار آئین کے مطابق عوام کا عطا کردہ ہوتا ہے جو کہ معاشرہ میں رعایا کی حیثیت رکھتے ہیں"۔ جدید دور میں حکومت کے معاشرتی اور معاشی فرائض میں اضافہ ہوا ہے۔ فرد کی تعمیر سیرت، معاشرتی عدل کا قیام، عوام کے معاشی تحفظ اور فلاح و بہبود جیسے مقاصد کو بہتر طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حکومت کی درجہ بندی(Classification of Government)

دورِ قدیم سے دور جدید تک حکومت کی اقسام کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔ علم سیاسیات کے بعض مفکرین جن میں ارسطو(Aristotle) بھی شامل ہے، حکومت کی اقسام کو ریاست کی قسمیں قرار دیتے ہیں، لیکن ماہرین سیاست اس کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے، حقیقت تو یہ ہے کہ ریاست کی درجہ بندی ممکن نہیں، کیونکہ دنیا کی تمام ریاستیں نوعیت اور عناصر کے لحاظ سے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر ریاست چار لازمی عناصر یعنی آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کی تمام ریاستیں ایک جیسی ہیں۔ البتہ حکومت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں۔ آج بھی بعض ممالک میں جمہوریت ہے اور بعض میں آمریت، کسی ملک میں پارلیمانی نظام حکومت ہے تو کسی ملک میں صدارتی طرز حکومت ہے۔

جدید نظمِ اجتماعی کی رو سے کوئی بھی صحت مند جمہوری ریاست دراصل چار بنیادی ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ گویا یہ چار ستون ایک صحت مند جمہوری ریاست کی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان چار ستونوں میں سے ایک ستون بھی زوال پذیر ہو جائے تو ریاست کا مجموعی نظم تتر بتر ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ریاست کے چاروں ستون اپنے اپنے مقام پر صحت مندانہ بنیاد پر پر استوار ہوں۔ چونکہ جمہوریت کے حقیقی معانی یہی ہیں کہ عوام کو عوام کے ذریعے عوام پر حکمرانی اور قانون سازی کا مکمل اور غیر مشروط حق دے دیا جائے، اس لئے مقننہ یعنی پارلیمنٹ کسی بھی خالص جمہوری ریاست کا اولین ستون ہوتی ہے۔ ذیل میں ہم ان ستونوں کی مختصر لیکن جامع تعبیر بیان کرتے ہیں

مقننہ: مُہذب معاشرے کی ترقی کے لیے قوانین بناتی ہے جو ریاست میں بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے نظام حیات کا تعین کرتے ہیں۔

انتظامیہ: ان قوانین کو نافذ کرتی ہے تاکہ لوگوں کو پرامن پر سکون ذہنی روحانی اور جسمانی خوشی حاصل ہو۔

عدلیہ: ملک میں عدل وانصاف قائم کرتی ہے۔ شہریوں کو آزادی اور بنیادی حقوق کا تحفظ فراہم کرتی ہے۔

میڈیا: شعور وآگہی اور بنیادی مسائل کو اجاگر کرنا، مگر تاحال یہ حکومت کے چوتھے ستون بننے میں ناکام ہے۔

فصل اول: مُقننہ

مقننہ مفعول مشتق اسم ظرفِ مکان ہے، لفظِ قانون ماخذ ہے جس کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں پر عوام کی خواہشات کے مطابق قانون سازی کی جائے یعنی جدید اصطلاح میں اسے ہم پارلیمنٹ اور مذہبی اصطلاح میں مجلسِ شوریٰ کہتے ہیں۔ پارلیمنٹ ایک ایسا خالص جمہوری ادارہ ہوتا ہے جس میں انسانی رویّے کو ضبط میں رکھنے کے لئے عوامی رائے سے قانون سازی کر کے عوام پر حکمرانی کی جاتی ہے۔ اس ادارے میں مختلف تعداد میں عوامی نمائندے قیام کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے متعلقہ حلقوں سے اپنے عوام کی نمائندگی کر سکیں اور عوام کے مزاج کے مطابق جزوی و جوہری قانون سازی کر سکیں۔ یہ ہے اصل اور خالص جمہوری ادارے یعنی پارلیمنٹ کا مختصر تعارفی کردار۔ علاوہ ازیں اس ادارے کے مختلف آئینی جزئیات ہوتے ہیں لیکن بنیادی کردار اس ادارے کا یہی ہے۔ یہ جمہوری ادارہ دراصل ایک صحت مند جمہوری ریاست کے عوام کا ترجمان ہوتا ہے یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ادارے میں ریاست کے ہر معزز شہری کا ایک ایسا نمائندہ موجود ہوتا ہے جس کو شہریوں نے خود اپنی کامل رضا سے اپنی ترجمانی سونپ دی ہوتی ہے۔ پس یہ اپنی اصل کے لحاظ سے حفظِ مراتب سے مشروط ہر شہری کی حکمرانی ہوتی ہے۔

فصل دوم: انتظامیہ

ریاست کا دوسرا اہم ترین ستون انتظامیہ یا حکومت کہلاتا ہے، تکنیکی زبان میں ہم اِسے بیوروکریسی بھی کہہ سکتے ہیں۔ انتظامیہ ایک مستقل اور غیر متبدل تنظیمِ امر ہے جو ریاست کے پیندے میں بہر حال موجود رہتا ہے۔ عوامی نمائندے عوام کی اکثریتِ رائے سے منتخب ہوتے ہیں جبکہ منتظم اپنی اعلیٰ بصیرت کی بنیاد پر منتخب کئے جاتے ہیں جیسا کہ معلمِ سیاست ارسطو نے کہا کہ ریاست کا انتظام ہمیشہ اہلِ دانش کے سپرد کیا جانا چاہئے بلکہ اہلِ دانش کے لئے الگ سے ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جائے جہاں پر وہ پر سکون ماحول میں رہ کر اپنی بصیرت سے ریاست کا نظم و نسق ترتیب دینے کا اہتمام کریں۔ جیسا کہ جمہوریت کی بنیاد عوامی رائے پر ہوتی ہے بالکل ایسے ہی انتظامیہ کی بنیاد میرٹ پر ہے۔ گویا اعلیٰ علمی بصیرت ہی اہلیانِ نظم و نسق کا انتخاب کرتی ہے۔ یہاں پر ایک باریک سا نکتہ یہ ہے کہ عوامی نمائندے انتظامیہ کی تنصیب و ترمیم کا حق تو رکھتے ہیں لیکن یہ حق صرف میرٹ کی بنیاد پر ہوگا۔ شومئ قسمت کہ مملکتِ عظمیٰ میں انتظامیہ کو سیاست میں ضم کر دیا گیا اور اعلیٰ و ادنی انتظامی امور کو عوامی نمائندوں کے رہن کر دیا گیا، جس کے سبب تنظیم و سیاست میں فرق ہی باقی نہ رہا۔ ایک اعلیٰ بصیرت کا حامل بیوروکریٹ سالوں سے اپنی خدمات تندہی سے سرانجام دے رہا ہوگا لیکن ایک نو منتخب عوامی نمائندہ اسے اٹھا کر کہیں ایسی جگہ بٹھا دے گا جہاں اس کی ساری صلاحیتیں اور حوصلے زمین بوس ہو جائیں گے۔ انتظامیہ پر سیاست کا یہ شعوری و غیر شعوری جبر دراصل ایک خالص اور صحت مند جمہوری ریاست کو تہس نہس کر دیتا ہے۔

فصل سوم: عدلیہ

عدلیہ ایک نظامِ قانون ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں رائج ہے۔ عدلیہ وہ نظام میں ہے جو عدل یعنی انصاف دیتا ہے۔ جو عدل یا انصاف کرتا ہے اسے قاضی، عادل، منصف یا جج کہا جاتا ہے اور جہاں انصاف یا عدل کیا جاتا ہے اس جگہ کو عدالت یا کورٹ کہا جاتا ہے۔ عدلیہ کے لغوی معانی فیصلے کرنا یا دو چیزوں میں باہم فرق کرنا لیکن اصطلاح میں اہلیانِ ریاست کو انصاف چاہنے والوں کے لیے مختلف اقسام کے امور میں انصاف کی بروقت فراہمی عدلیہ کہلاتی ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے کہ انسانی رویہ کو ضبط میں رکھنے کے لئے قانون کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن چونکہ انسان فطری طور پر ضبط شکن واقع ہوا ہے، اس لئے معاشرے میں غیر متوازن رویوں کے سبب اخلاقی و آئینی بحران رونما ہو جاتا ہے۔ پس اس اخلاقی بحران اور آئین شکنی کا سدِ باب کرنے کے لئے فصلِ باہم (عدالت) کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ کسی بھی خالص جمہوری ریاست کے بنیادی چار ستونوں میں عدلیہ کو تیسرے بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہے۔

فصل چہارم: میڈیا

ذرائع ابلاغ سے مراد دراصل وہ ریاستی اور نجی ادارے ہیں جو ایک خالص جمہوری ریاست میں سماجی، اخلاقی اور آئینی مسائل کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ قریبی وقت میں یہ ادارے اخبار اور رسائل تک محدود تھے۔ چنانچہ اس وقت ذرائع ابلاغ کی صرف ایک ہی صورت موجود تھی جسے معروف اصطلاح میں صحافت سے تعبیر کیا جاتا تھا، جبکہ فی زمانہ ذرائع ابلاغ کا دائرہ غیر یقینی طور پر وسیع ہو گیا ہے۔ جدید تکنیکی ترقی کے سبب اب خبر قرطاس سے اڑ کر برقی آلات میں مزیّن ہو گئی ہے۔ چنانچہ آج اخبار و رسائل کی جگہ انٹرنیٹ اور ٹی وی نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اصطلاحات بھی تبدیل ہو گئیں، چنانچہ قدیم ابلاغی اصطلاح 'صحافت' کی جگہ آج 'میڈیا' نے لے لی ہے۔ پس اس کی بھی تین اہم بنیادی جزئیات وقوع پذیر ہو گئی ہیں۔ سوشل میڈیا (سماجی محاذ) پرنٹ میڈیا (اشاعتی محاذ) اور الیکٹرانک میڈیا (برقی محاذ)، سوشل میڈیا کی جزئیات میں آج کل فیس بک، ٹویٹر وغیرہ جبکہ پرنٹ میڈیا میں اخبارات و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا میں مختلف ٹی وی چینلز اس وقت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ کسی بھی خالص جمہوری ریاست میں ان چار ستونوں کا صحت مند اور آزاد ہونا بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ اعلیٰ ترین نظمِ اجتماعی برقرار رہے، لاء اینڈ آرڈر کی برقرار صورت، انصاف کی بروقت فراہمی اور ذرائع ابلاغ کا مثبت اور بہترین اخلاقی کردار قائم ہو سکے۔

باب سوم: اسلام اور جمہوریت

فصل اول: جمہوریت کا اسلامی تصور

جمہوریت کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ عوام کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لیے عوام کی اکثریت کی رائے پر عمل کیا جائے۔ یہ نہ صرف انتہائی فطری اور واحد قابل عمل طریقہ ہے بلکہ دین کے تقاضوں کے بھی عین مطابق ہے۔ قرآن کا حکم اَمرُھم شُوریٰ بینھم اسی کا بیان ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کے معاملات ان کے مشورے/رائے سے چلائے جانے چاہئیں۔ اس حکم کا تقاضا محض یہ نہیں ہے کہ ان سے رسمی طور پر مشورہ کر لیا جائے بلکہ ان کے مشورہ کے مطابق ہی فیصلہ بھی کیا جائے، اور یہ مشورہ بھی کسی خاص طبقے یا گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ تمام لوگوں کو مشورے/رائے کا یکساں حق دیا جائے، اسی کا نام جمہوریت ہے۔ اسلام نے اَمرُھم شُوریٰ بینھم کا ایک واضح اصول دیا ہے جس میں حکمرانوں کا انتخاب اور معزول ہونا اور باقی اجتماعی معاملات بھی لوگوں کی مرضی سے طے کیے جاتے ہیں۔ خلافت راشدہؓ کے انتخاب میں بھی یہی اصول کارفرما رہا اور تمام خلفائے راشدینؓ اصلاً لوگوں کی مرضی سے ہی حکمران بنے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اپنی نامزدگی کے باوجود لوگوں کی آزاد مرضی کے بعد ہی اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔

جمہوریت کا متبادل صرف آمریت

جمہوریت کا متبادل صرف اور صرف آمریت ہے۔ یعنی محض طاقت کے بل بوتے پر عوام کے حق حکمرانی کو غصب کر لینا۔ اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو جس طرح آج خلافت کے نام پر مدعی اقلیت میں ہونے کے باوجود طاقت اور جبر کی بنیاد پر اپنا غلبہ حق بجانب سمجھتے ہیں، اسی طرح کل کوئی مغرب زدہ یا کمیونسٹ اقلیت یا کسی اقلیتی مسلک کے ماننے والے بھی اگر طاقت حاصل کر لیتے ہیں تو کیا آپ انھیں یہ حق دینے کے لیے تیار ہیں کہ وہ بالجبر آپ پر مسلط ہو جائیں۔ طاقت کے قانون کے اس اصول کو اگر مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ مستقل انتشار اور انارکی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ لہذا ہمیں واپس عوامی رائے کی طرف آنا ہو گا۔

تشکیلِ حکومت میں عوامی رائے کی اہمیت

حکومت کے انعقاد میں عوامی رائے اور استصواب کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبد الرحمان بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے انتخاب میں عوامی رائے معلوم کرنے میں کس قدر محنت اور جان فشانی سے کام لیا:

"پھر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ان دونوں (حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ) کے متعلق لوگوں سے مشورہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ آپ اکابر سے بھی مشورہ کرتے اور ان کے پیروکاروں سے بھی، اجتماعاً بھی اور متفرق طور پر بھی، اکیلے اکیلے سے بھی اور دو دو سے بھی، خفیہ بھی اور علانیہ بھی، حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی مشورہ کیا۔ مدرسے کے طالب علموں سے بھی، اور مدینہ کی طرف آنے والے سواروں سے

بھی، بدوؤں سے بھی جنھیں وہ مناسب سمجھتے۔ تین دن اور تین راتیں یہ مشورہ جاری رہا۔ آپ نے دو آدمیوں کے سوا سب لوگوں کو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے حق میں پایا، البتہ حضرت عمارؓ اور مقدادؓ نے حضرت علیؓ کے حق میں مشورہ دیا۔ بعد میں ان دونوں نے بھی (حضرت عثمانؓ) کی دوسرے لوگوں کے ساتھ بیعت کی جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے۔ سو حضرت عبدالرحمنؓ ان تین دن اور تین راتوں میں بہت کم سوئے۔ وہ اکثر نماز، دعا، استخارہ اور ان لوگوں سے مشورہ میں وقت گزارتے تھے جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے۔ سو آپ نے (اس مشورہ کے دوران) کسی کو بھی نہ پایا جو حضرت عثمانؓ کے برابر کسی کو سمجھتا ہو۔" (البدایۃ والنھایۃ، ج ۷، ص ۱۴۷) اس روایت کے مطابق بچوں اور خواتین سے بھی رائے لی گئی جبکہ آج کی جمہوریت میں اٹھارہ سال کی شرط لازمی ہے۔

خلافت راشدہؓ میں کثرتِ رائے کی اہمیت:

جمہوریت میں اکثریت کی رائے کے مطابق سربراہ ریاست کا تعین ہوتا ہے۔ کثرتِ رائے کے ساتھ انتظامی اور بعض اوقات شرعی معاملات کا فیصلہ قرنِ اول میں بھی رائج تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے جب کوئی نیا معاملہ آتا تو وہ اس کو قرآن و حدیث میں تلاش کرتے، وہاں نہ ملتا تو صحابہ کرامؓ سے ان کے گھر جا کر ملاقات کرتے اور اس میں بھی کامیاب نہ ہوتے تو اصحاب رائے صحابہ کرام کو جمع کر کے ان کے سامنے مسئلہ رکھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول تھا، عام طور پر قرآن و حدیث کے سامنے آجانے کے بعد اتفاق رائے ہو جاتا ، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن و حدیث کی طرف مراجعت میں خِفایا ظاہری تعارض کے سبب یا امور انتظامیہ میں اختلاف رائے کے باعث اتفاق نہ ہو سکا، تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا۔

خلافت راشدہ کے پورے عہد میں ایک نظیر بھی اسی طرح کی پیش نہیں کی جا سکتی کہ امیر المومنین نے محض اپنی رائے کو یا اقلیت کی رائے کو یہ کہہ کر نافذ کیا ہو کہ ایسا کرنا ان کے اختیار میں داخل ہے، البتہ اس طرح کے متعدد واقعات ملیں گے کہ امیر المومنین اپنی مدلل اور مضبوط رائے کو نافذ کرنے سے محض اس لیے رکے کہ اکثریت ان کے حق میں نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت کا انعقاد بھی شوریٰ اور کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ سقیفۂ بنو ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی بھاری اکثریت نے کیا ہے، بنو ہاشم کے خواص اور انصار کے شیخ قبیلہ حضرت سعد بن معاذؓ کی رائے اس وقت ان کے حق میں نہیں تھی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشورہ کیا تو مشورہ کی خصوصی مجلس میں اختلاف ہو گیا، پھر جب آپ نے رائے عامہ معلوم کی تو وہ بالاتفاق حضرت عمرؓ کے حق میں گئی اس لیے یہ انتخاب بھی شوریٰ اور کثرت رائے سے ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو چھ اراکین پر مبنی مجلس شوریٰ نامزد کی تھی، اس نے بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ رائے عامہ کی کثرت دیکھ کر کیا ہے۔ اور اسی رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے۔ خلافت راشدہ میں عددی کثرت کے فیصلہ کن ہونے کی سب سے عمدہ وضاحت حضرت

عمر کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کی تفصیلات سے ہوئی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو یہ ہدایت کی تھی کہ اگر اتفاق رائے سے انتخاب عمل میں آجائے تو سب سے اچھی بات ہے اور اگر اختلاف رائے ہو جائے تو اکثریت کے مطابق انتخاب کیا جائے۔ خلافت راشدہ میں عام طور پر مسائل کے حل کے لیے مجلس شوریٰ نے کتاب وسنت کی طرف مراجعت کی ہے اور جب کوئی مسئلہ صاف ہو گیا ہے تو عام طور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اور اگر اختلاف باقی رہا ہے تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا ہے۔

فقہاء کرام کی نظر میں کثرتِ رائے کی اہمیت:

کثرتِ رائے بعد میں آنے والے فقہا کے ہاں بھی حجتِ شرعیہ کے طور پر موجود ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں فقہا کا اختلاف رائے ہو تو وہاں کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح کا اصول موجود ہے۔ کثرتِ رائے کی بنیاد پر ترجیح کی بات دو موقعوں پر کہی گئی۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ائمہ احناف سے کوئی قول منقول نہیں ہے، اور فقہائے متاخرین کے ہاں بھی اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہو جائے، تو اس سلسلہ میں اکثریت کے قول پر عمل کیا جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں دو قول ہیں اور دونوں ہی کو صحیح قرار دیا گیا ہے، ان دونوں صحیح اقوال میں سے ایک قول کو ترجیح دینے کے سلسلے میں کثرتِ رائے کے اصول کو مان لیا گیا ہے، یعنی اس صورت میں جس قول کو زیادہ لوگوں نے اختیار کیا ہو، وہی معتبر ہو گا۔ غرض یہ ہے کہ کثرت رائے کے وجہ ترجیح یا شرعاً معتبر ہونے کے لیے قرآن کریم، احادیث پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، خلفائے راشدین کا عمل اور فقہائے کرام کی تصریحات سب ہی موجود ہیں، اس لیے اگر شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے تو ایسی صورت میں اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے میں شرعاً کوئی تنگی نہیں ہے، اور اگر اکثریت پر فیصلے کی بات باہمی معاہدہ یا دستور اساسی کی صورت میں طے کر لی گئی ہو تو پھر صرف اکثریت ہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ضروری ہو جائے گا۔

فصل دوم: جمہوریت کے متعلق مذہبی شبہات وخدشات کاازالہ

حاکمیتِ عوام یااقتدارِاعلی کی بنیادپر تکفیر

جمہوریت کو "حاکمیت عوام" کے نظریے کی بنیادپر کفریہ نظام قرار دینےاور حاکمیتِ عوام کواس کالازمی جُزوقرار دینے والے گروہ کی طرف سے ایک اعتراض یہ اٹھایاجاتاہے کہ جمہوریت میں اگرآئینی طورپر قرآن وسنت کی پابندی قبول کی جاتی ہے، تواس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ خداکا حکم ہے جس کی اطاعت لازم ہے، بلکہ اس اصول پر کی جاتی ہے کہ یہ اکثریت نے خوداپنےاوپر عائد کی ہےاور وہ جب چاہے، اس پابندی کو ختم کرسکتی ہے۔اس لیےآئین میں اس کی تصریح کے باوجود جمہوریت درحقیقت ''حاکمیت عوام''ہی کے فلسفے پر مبنی نظام ہے۔اس استدلال کے دونکتے ہیں اور ہم ان دونوں نکتوں کاجواب الگ سے تحریر کرتے ہیں:

پہلاخدشہ: قرآن وسنت کی پابندی کے لئے کثرت رائے کی شرط :ا

آئین میں قرآن وسنت کی پابندی دراصل قرآن وسنت کے واجب الاتباع ہونے کے عقیدے کے تحت نہیں، بلکہ محض اسلئے قبول کی جاتی ہے کہ اکثریت یہ پابندی قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

جواب: سوال یہ ہے کہ اگرآئین میں اس تصریح کامطلب یہ نہیں کہ آئین سازاسمبلی خود کوقرآن وسنت کاپابند سمجھتی ہےاور یہ محض حاکمیتِ عوام کے اصول کاایک اظہار ہے، تواس مقصد کے لیے اسمبلی کو یہ تصریح کرنے کی آخر ضرورت اور مجبوری ہی کیادرپیش ہے؟ پھر توآئین میں سادہ طورپر صرف یہ بات لکھنی چاہیے کہ قانون سازی کامدار اکثریت کی رائے پر ہےاوراس بنیادپر جو بھی قانون بنے گا، وہ اس وقت تک قانون رہے گاجب تک اسے اکثریت کی تائید حاصل رہے۔جب آئین سازاسمبلی اس سے آگے بڑھ کر باقاعدہ ایک اصول کے طورپر یہ نکتہ آئین میں شامل کر

رہی ہے کہ مقننہ قرآن وسنت کے احکام کی پابند ہو گی تو کس اصول کی رو سے اس پر یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی پابندی کو بالذات اور مستقل اصول کے طور پر قبول نہیں کر رہے ہیں۔

۲: آئین میں اکثریت کی رائے پر تبدیلی

چونکہ آئین میں اکثریت کی رائے کی بنیاد پر تبدیلی کی جاسکتی ہے اور اس اصول کے تحت اگر کسی وقت اکثریت قرآن وسنت کی پابندی کی شرط کو ختم کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کی پابندی کو فی نفسہ اور بالذات نہیں، بلکہ محض اکثریت کی رائے کی بنیاد پر قبول کیا جارہا ہے۔

جواب: سوال یہ ہے کہ دین وشریعت بلکہ دنیا کے کسی بھی قانون یا ضابطے کی پابندی قبول کرنے کا آخر وہ کون سا اسلوب یا پیرایہ ہو سکتا ہے جس میں یہ امکان موجود نہ ہو کہ کل کو پابندی قبول کرنے والا اس کا منکر نہیں ہو جائے گا؟ مثال کے طور پر ایک شخص کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرتا ہے، تو اسے اس بنیاد پر مسلمان تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مرضی اور آزادی سے یہ فیصلہ کیا ہے، حالانکہ اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ کسی بھی وقت اسی آزادی کی بنیاد پر اسلام سے منحرف ہونے کا فیصلہ کر لے۔ اب کیا اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ چونکہ کل کو وہ اپنی مرضی سے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے، اس لیے آج اس کے کلمہ پڑھنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی نفسہ واجب الاتباع نہیں سمجھتا، بلکہ اپنی ذاتی پسند اور مرضی کی وجہ سے قبول کر رہا ہے؟ دنیا کے ہر معاہدے اور ہر ضابطے کی پابندی کی بنیاد اسی آزادی پر ہوتی ہے جو انسانوں کو حاصل ہے اور جو آج کسی پابندی کے حق میں اور کل اس کے خلاف بھی استعمال ہو سکتی ہے، لیکن ہم اس آزادی کے منفی استعمال کے بالفعل ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی مستقبل کے امکانی مفروضوں کی بنیاد پر حال میں یہ قرار نہیں دیتے کہ فلاں شخص یا گروہ درحقیقت اس قانون یا ضابطے کو فی حد ذاتہ واجب الاتباع ہی تسلیم نہیں کرتا۔

۳: شرعی احکام پر حکومتی عمل درآمد قانون سازی کا محتاج ہے:

جمہوریت میں شریعت کے واضح اور مسلمہ احکام بھی کسی ملک میں اس وقت تک قانون کا درجہ اختیار نہیں کر سکتے، جب تک کہ منتخب قانون ساز ادارہ اسے بطور قانون منظور نہ کر لے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمہوریت میں اللہ کی شریعت کا نفاذ انسانوں کی منظوری کا محتاج ہے، اگر وہ بطور قانون اسکی منظوری نہ دیں تو کوئی حکم شرعی نافذ نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک کفریہ تصور ہے۔

جواب: اس دلیل میں جو منطقی مغالطہ ہے اسے ایک مثال کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کریں ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں شریعت کا واضح اور قطعی حکم ہے کہ قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کیا جائے۔ لیکن شریعت کا یہ حکم اس وقت تک عملاً نافذ نہیں ہو سکتا جب تک یہ مقدمہ باقاعدہ کسی بااختیار عدالت کے سامنے پیش نہ کیا جائے اور عدالت یہ فیصلہ نہ سنا دے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شریعت کا حکم اپنے نفاذ کے لیے ایک جج کی منظوری کا محتاج ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اس لیے کہ شریعت کے حکم اور اس پر عمل درآمد کے درمیان عدالت کا کردار اس تصور کے تحت نہیں رکھا گیا کہ خدا کی شریعت انسانی تائید کی محتاج ہے، بلکہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس حکم کے نفاذ کے عمل کو منضبط اور غلطیوں سے محفوظ بنایا جا سکے۔ بالکل یہی معاملہ کسی شرعی حکم کو قانون سازی کے مرحلے سے گزارنے کا ہے۔ جب آئین میں اصولی طور پر یہ مان لیا گیا کہ شریعت بالادست قانون ہو گی، تو تمام واضح اور قطعی احکام اصولاً قانون کا درجہ اختیار کر گئے۔ اس کے بعد ان احکام کے حوالے ہیں نہ کہ اس بنیاد پر کہ احکام شرعیہ کو (procedural) سے قانون سازی کے مراحل بنیادی طور پر پروسیجرل ابھی قانون بننے کے لیے منظوری کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ خاص طور پر ملحوظ رہنا چاہیے کہ شریعت کا کوئی بھی واضح اور صریح حکم اس وقت تک نفاذ میں نہیں آ سکتا جب تک اس کے ساتھ جڑے ہوئے چند اجتہادی سوالوں کا جواب نہ دے دیا جائے۔ مثلاً چوری کو لیجیے۔ محض یہ تسلیم کر لینے سے کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، کسی بھی چوری کے مقدمے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکم کے اطلاق کے لیے شاید درجنوں اجتہادی سوالات کا جواب دینا پڑے گا اور اس کے لیے کسی نہ کسی اجتہادی تعبیر کو قانون کا درجہ دینا پڑے گا۔ مثلاً یہ کہ چوری کا مصداق کیا ہے؟ کتنے مال کی

چوری پر یہ سزا لاگو ہو گی؟ کیا ہر طرح کے حالات میں یہ سزا دی جائے گی یا کچھ مخصوص حالات میں رعایت بھی دی جا سکتی ہے؟ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اجتہادی سوالات ہیں جو نص میں صراحتاً مذکور نہیں اور ان کا جواب طے کیے بغیر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ہر واضح اور قطعی شرعی حکم نفاذ کے لیے ایک اجتہادی تعبیر کا محتاج ہے۔ قانون سازی دراصل اسی درمیانی مرحلے کو طے کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ قانون کے بنیادی پہلوؤں کی ایک متعین تعبیر کے بغیر، جس کی روشنی میں عدالتیں فیصلے کر سکیں، قانون کے نفاذ میں بہت سی پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جدید سیاسی نظام میں قانون ساز ادارے اس نوعیت کی پیچیدگیوں کو کم کرنے اور قانون کے بنیادی پہلوؤں کو واضح اور متعین کرنے کے کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر قانون کے بنیادی خطوط اور حدودِ اربعہ متعین نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ قانون کی براہ راست تعبیر کا کام عدالتوں کو کرنا پڑے گا جس میں اختلافات کا پیدا ہونا اور اس کے نتیجے میں قانونی سطح پر پیچیدگیوں کا سامنے آنا ناگزیر ہے۔ علمی اور نظری سطح پر کسی قانون کی تعبیر میں اختلافات ہوں تو ان سے عملی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں، لیکن قانونی نظام کی سطح پر بہر حال ایک بنیادی نوعیت کی یکسانی پیدا کرنا انتظامی پہلو سے ایک مجبوری کا درجہ رکھتا ہے۔

جمہوریت میں شرعی احکام کو نفاذ سے پہلے قانون ساز ادارے کی منظوری کے مرحلے سے گزارنا دراصل اسی پہلو سے ضروری ہوتا ہے، نہ کہ اس مفروضہ تصور کے تحت کہ شریعت کا حکم تب واجب العمل ہو گا جب انسان اسے قانون کے طور پر منظور کر لیں گے۔ چنانچہ صورت حال کی درست تعبیر یہ ہو گی کہ آئین کی اسلامی نوعیت طے ہو جانے کے بعد تمام احکام شریعت کی پابندی قبول کر لی گئی، البتہ انھیں قانون کی سطح پر نافذ کرنے کے لیے کچھ درمیانی مراحل طے کرنا ضروری تھا جن میں سب سے اہم مرحلہ قانون کی تعبیر کا تھا۔

قرآن کی رو سے اکثریت کی رائے پر فیصلہ گمراہی ہے۔ :۴

جمہوریت کو خلاف اسلام سمجھنے والے قرآن کی چند آیات سے استدلال کرتے ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اکثریت کی پیروی نہ کرو کیونکہ اکثریت گمراہ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ایک آیت یہ ہے :

وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ ۱ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ

اور اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کہنا مان لوگے تو وہ تمھیں خدا کا رستہ بھلا دیں گے۔ یہ محض " خیال کے پیچھے چلتے اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں"۔

جواب: اس آیت اور اس مفہوم کی دوسری آیات سے واضح ہے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو رسول کے منکرین ہیں اور جانتے بوجھتے رسول کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ رسولوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے لوگ عموماً اکثریت میں رہے ہیں اور رسولوں پر ایک قلیل تعداد ہی ایمان لاتی ہے۔ رسولوں اور ان کے ماننے والوں کو منکرین اور معاندین کی اس اکثریت کی پیروی سے منع کیا جا رہا ہے۔ اس بات کا اس سے کیا تعلق ہے کہ جب رسول کے ماننے والے ایک معاشرہ منظم کر لیں تو اب کے معاملات ان ہی کی اکثریت کی رائے سے چلائے جائیں۔

۵: جمہوریت میں اکثریت حق و باطل کی معیار ہے:

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اکثریت کی رائے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکثریت حق و باطل کا معیار بن گئی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ صحیح اور غلط کا معیار تو صرف دلیل ہے۔ اکثریت کی رائے تو اصل میں فصلِ نزاعات کا ایک طریقہ ہے۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں واحد قابل عمل اور دوسرے تمام ممکنہ طریقوں کے مقابلے میں سب سے بہتر اور کم نقصان دہ طریقہ ہے۔ اگر فیصلہ سازوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہو جائے تو فیصلہ کرنے کا اس کے سوا کیا مہذب راستہ باقی بچتا ہے کہ اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے۔ اس کے سوا تمام طریقوں کا انجام انتشار اور انارکی ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرض کیجیے فیصلہ سازوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کسی تعلیمی ادارے میں مخلوط تعلیم کا انتظام کیا جائے یا لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ انتظام کیا جائے۔ فیصلہ ساز دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ قلیل گروہ کی رائے یہ ہے کہ دین کی تعلیمات کسی صورت مخلوط نظام کی اجازت نہیں دیتیں۔ کثیر گروہ کی رائے میں دین ہی کی تعلیمات کی روشنی میں اس

بات کی گنجائش موجود ہے کہ شائستگی اور وقار کے ساتھ حدود کے اندر رہتے ہوئے مخلوط نظام کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ اب قطع نظر اس سے کہ صحیح رائے کس گروہ کی ہے، فیصلہ کی فطری بنیاد اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے۔ یہ کسی صورت باطل کی پیروی نہیں ہے۔ اس طریقے میں یہ امکان بہر حال موجود ہے کہ غلط فیصلہ عمل میں آجائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ راستہ بھی کھلا ہے کہ قلیل گروہ دلائل سے کثیر گروہ کو اپنی رائے کے حق میں قائل کر لے اور فیصلہ اس رائے کے حق میں تبدیل ہو جائے۔

غلط فیصلہ ہو جانے کا امکان اگر کوئی نقص ہے تو یہ نقص مفروضہ 'خلافت' کے نظام میں بھی بعینہٖ موجود ہے۔ خلیفہ یا اس کی شوریٰ پر وحی تو نازل ہو گی نہیں۔ تمام تر تقویٰ اور تدین کے باوجود وہ بہر حال انسان ہی ہوں گے، جن سے ہر وقت خطا کا وقوع ممکن ہے۔ یہ خطا فیصلوں میں بھی ممکن ہے اور بالکل اسی طرح ممکن ہے جس طرح جمہوریت میں۔ سیدنا عمرؓ نے ایک موقع پر مہر کی تحدید کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ایک خاتون کے توجہ دلانے پر آپ نے اس فیصلہ کو غلط مانتے ہوئے واپس لے لیا۔ بہت ممکن تھا کہ بعد میں کسی دوسرے فرد کے توجہ دلانے پر یا خود ہی اپنی رائے تبدیل ہو جانے پر سیدنا عمرؓ پھر پہلی رائے کے قائل ہو جاتے۔ کیونکہ یہ رائے تو بہر حال موجود ہے کہ حکمران مخصوص حالات میں مہر کی تحدید کا اختیار رکھتا ہے۔ مختصراً یہ کہ جب 'خلافت' کے نظام میں بھی غلط فیصلے ہو سکتے ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے کوئی انتظام بنانا پڑ سکتا ہے تو یہی انتظام 'جمہوریت' میں بھی ہو سکتا ہے۔

۶: جمہوریت میں عالم و جاہل دونوں کا ووٹ برابر ہے:

جمہوریت کا ایک اور نقص یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں ہر ایک فرد حکومتی سربراہ کے انتخاب میں اپنا ووٹ استعمال کر سکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر فطری، غیر منصفانہ اور بیہودہ طریقہ ہے۔ آخر ایک جاہل، گنوار، غیر متقی فرد کی رائے ایک عالم، متقی، ذہین اور قابل فرد کی رائے کے برابر کیسے ہو سکتی ہے؟

جواب: ہماری رائے میں یہ نقطہ نظر بھی مغالطوں پر مبنی ہے۔ شریعت اور فقہ دونوں کی نظر میں قانونی طور پر ہر مسلمان برابر ہے۔ اللہ کی نظر میں اور آخرت میں اجر کے لحاظ سے لوگوں کے درجات جو بھی ہوں، قانونی حقوق و فرائض کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ لہٰذا سب کا ووٹ/مشورہ/رائے بھی برابر ہے۔ قرآن مجید کے حکم اَمرھم شوریٰ بینھم کا لازمی تقاضا ہے کہ جن لوگوں کے معاملات ہوں ان سب کی رائے فیصلہ میں شامل ہو۔ مثلاً اگر پاکستان کا حکمران بنانے کا معاملہ کروڑ لوگوں سے متعلق ہے تو لازماً 20 کروڑ لوگوں کی رائے سے ہی فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ آخر کسی محدود طبقے یا گروہ کو یہ حق کیسے اور کس اصول کے تحت دیا جائے کہ وہ ان بیس کروڑ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ خود کر دیں؟ یہ یقینی طور پر اَمرُھم شُوریٰ بینھم کے اصول کی خلاف ورزی ہو گی۔ اور فرض کریں آپ یہ حق، مثال کے طور پر، علما کے طبقے کو دیتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ محض اپنی رائے سے کریں تو یہ اعتراض پھر اٹھتا ہے کہ علما بھی عمر، علم، تقویٰ اور اہلیت کے لحاظ سے مختلف درجوں کے ہوں گے تو ان سب کی رائے یا ووٹ کیوں برابر ہو؟ ایک عالم آج درس نظامی کی تکمیل کر کے فارغ ہوا ہے اور دوسرا عالم سال پہلے عالم بنا تھا اور تخصص کر کے آج شیخ القرآن، شیخ الحدیث یا مفتی کے درجے پر فائز ہے۔ ان دونوں کو رائے یا ووٹ کا یکساں حق کس اصول کی بنیاد پر دیا جائے؟ اسی طرح ایک ڈاکٹر آج ڈاکٹر بنا ہے اور دوسرا سال کا تجربہ رکھنے والا اسپیشلسٹ ہے۔ ان دونوں کو رائے یا ووٹ کا یکساں حق کیوں دیا جائے؟ علیٰ ھذا القیاس۔ الغرض یہ کہ آپ ووٹ دینے کے لیے جو بھی تحدید کر دیں آپ کو بہر حال ووٹ کے حقدار طبقے یا گروہ کے معاملے میں یہ سمجھوتہ کرنا پڑے گا کہ بلا لحاظ علم، تقویٰ و تدین، تجربہ اور مہارت اس طبقہ کے ہر فرد کا ووٹ برابر تسلیم کریں۔ تو آخر یہ سمجھوتہ بیس کروڑ عوام کے بارے میں کرنے میں کیا قباحت ہے جبکہ معاملات بھی تمام کے تمام عوام سے متعلق ہوں۔

۷: مصورِ پاکستان علامہ اقبالؒ جمہوریت کے مخالف ہیں:

نظریۂ پاکستان کے بانی علامہ محمد اقبال کے کئی اشعار جمہوریت کی مخالفت میں ہیں۔ اس لیے پاکستان میں جمہوریت کی ترویج اور پرچار خود نظریۂ پاکستان کے بانی کے نظریات کے مخالف ہے۔

جواب: جمہوریت کے خلاف علامہ اقبالؒ کے اشعار تو بہت دہرائے جاتے ہیں۔ آیئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھتے ہیں۔

(The Reconstruction of religious thoughts in Islam) "علامہ اقبال اپنے خطبات "تشکیل جدید فکریات اسلام میں فرماتے ہیں:

"گزشتہ پانچ سو برس سے اسلامی فکر عملی طور پر ساکت و جامد چلی آ رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب مغربی فکر اسلامی دنیا سے روشنی اور تحریک پاتا تھا۔ تاریخ کا یہ عجب طرفہ تماشہ ہے کہ اب دنیائے اسلام ذہنی طور پر نہایت تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے، گو یہ بات اتنی معیوب نہیں کیونکہ جہاں تک یورپی ثقافت کے فکری پہلو کا تعلق ہے، یہ اسلام ہی کے چند نہایت اہم ثقافتی پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ڈر ہے تو صرف یہ کہ یورپی ثقافت کی ظاہری چمک کہیں ہماری اس پیش قدمی میں حارج نہ ہو جائے اور ہم اس ثقافت کی اصل روح تک رسائی میں ناکام نہ ہو جائیں۔ ہماری ذہنی غفلت کی ان کئی صدیوں میں یورپ نے ان اہم مسائل پر سنجیدگی سے سوچا ہے، جن سے مسلمان فلاسفہ اور سائنس دانوں کو گہری دلچسپی رہی تھی"۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اہل سنت کے قوانین (فقہ) کی رو سے امام یا خلیفہ کا تقرر ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں جو پہلا سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا خلافت فرد واحد تک محدود رہنی چاہیے، ترکوں کے اجتہاد کی رو سے یہ اسلام کی روح کے بالکل مطابق ہے کہ خلافت یا امامت افراد کی ایک جماعت یا منتخب اسمبلی کو سونپ دی جائے، جہاں تک میں جانتا ہوں مصر اور ہندوستان کے علما اسلام اس مسئلے پر ابھی تک خاموش ہیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ترکوں کا موقف بالکل درست ہے اور اس کے بارے میں بحث کی بہت کم گنجائش ہے۔ جمہوری طرز حکومت نہ صرف یہ کہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، بلکہ یہ عالم اسلام میں ابھرنے والی نئی طاقتوں کے لحاظ سے بہت ضروری ہے"۔

آج کے مسلمان کو چاہیے کہ اپنی اس اہمیت کو سمجھیں، بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی عمرانی زندگی کی از سر نو تشکیل کریں اور اسلام کے اس مقصد حقیقی کو حاصل کریں، جس کی تفصیلات تاحال ہم پر پوری طرح واضح نہیں ہیں، کا قیام"۔(Spiritual Democracy) یعنی روحانی جمہوریت

۸: جمہوریت میں بدعنوان لوگوں کے ووٹ پر اعتراض اور علامہ اقبال کا نقطۂ نظر:

جمہوریت پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہمارے عوام کی اکثریت بدعنوان، بدکردار اور کم علم لوگوں پر مشتمل ہے لہٰذا وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کو منتخب کریں گے۔ یہ تو بہر حال حقیقت ہے کہ جیسا معاشرہ ہوتا ہے عموماً ویسے ہی اس کے حکمران ہوتے ہیں، اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ غیر فطری اور مصنوعی طریقہ سے طاقت کے زور پر کسی دین دار فرد کو 'خلیفہ' بنا دیا جائے۔ ایسا حکمران یا تو معاشرے کی طرف سے مسترد کر دیا جائے گا یا معاشرے جیسا ہی بن جائے گا۔ صحیح اور فطری طریقہ صرف یہ ہے کہ معاشرے کے اخلاق و کردار کی تربیت کی جائے، جس حد تک معاشرہ بہتر ہو گا اسی کے بقدر اجتماعی نظام بھی بہتر ہوتا جائے گا۔ یہی بات علامہ اقبال اپنے خطبات میں ان الفاظ میں کہتے ہیں:

جدید مسلم اسمبلی کی قانونی کارکردگی کے بارے میں ایک اور سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ کم از کم موجودہ صورتحال میں اسمبلی کے زیادہ تر ممبران مسلم فقہ (قانون) کی باریکیوں کے بارے میں مناسب علم نہیں رکھتے۔ ایسی اسمبلی قانون کی تعبیرات میں کوئی بہت بڑی غلطی کر سکتی ہے۔ قانون کی تشریح و تعبیر میں ہونے والی ان غلطیوں کے امکانات کو ہم کس طرح ختم یا کم سے کم کر سکتے ہیں۔ غلطیوں سے پاک تعبیرات کے امکانات کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلمان ممالک موجودہ تعلیم قانون کے نظام کو بہتر بنائیں، اس میں وسعت پیدا کریں اور اس کو جدید فلسفہ قانون کے گہرے مطالعے کے ساتھ وابستہ رکھا جائے"۔

۹: سربراہِ ریاست کے لیے قریشی ہونے کی شرط:

اسلام میں سربراہِ ریاست کے لیے قریشی ہونا شرط ہے اور اس شرط پر فقہائے اسلام کا اتفاق ہے، جبکہ جمہوریت میں ہر کوئی ریاست کا سربراہ بن سکتا ہے، چاہے وہ قریشی ہو یا غیر قریشی۔

جواب: بہت سے لوگوں نے حدیث الأئمۃ من قریش اور اجماعِ صحابہؓ واہل کلام سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کا سربراہ قریش کے علاوہ اور کوئی نہیں بن سکتا۔ مگر اکابر علم دین اور فقہ کے محققین پر مخفی نہیں کہ خود حضرت عمرؓ سے ایسی قابل اعتماد روایتیں منقول ہیں (جن کو امام احمدؒ نے مسند میں ذکر فرمایا ہے)، جو حضرت معاذؓ بن جبلؒ اور سالمؓ مولی حذیفہ جیسے غیر قریشیوں کے لیے حکومت کی سربراہی کا استحقاق ظاہر کرتی ہیں۔ اس سے حضرات صحابۂ کرامؓ کے اجماع کی قطعیت میں تردد پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ائمۂ علم کلام میں امام ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر اشعری متکلم نے بھی اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے، جس کی وجہ سے اہل کلام کے اجماع میں بھی تردد پیدا ہوا۔ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں صحابہؓ کا اس حدیث کو قبول کر لینا اس اجماع پر قطعی دلیل نہیں ہو سکتا کہ قریشیت خلافت کی ایسی شرط ہے جس کے بغیر شرعی خلافت ممکن ہی نہیں۔

اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخری زمانہ میں خلیفہ ہونا اور قحطانی کا بادشاہ ہونا صحیح احادیث میں مروی ہے۔ قحطانی کی بادشاہت ہی پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا ہے اور حدیث قریش سے اس کو رد کرنا چاہا ہے، مگر علمائے حدیث اور ائمہ اہل سنت اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

اس حدیث پر غور کر لینے کے بعد اس کے دو مفہوم سامنے آتے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ آئندہ جو لوگ خلیفہ بنیں گے، وہ قریش سے ہوں گے۔ اس صورت میں حدیث کا منشا یہ ہو گا کہ قریش امامت وخلافت کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ اس وقت تمام عرب صرف قریش کو اس منصب کے لیے مناسب سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں: عرب سربراہی کا استحقاق قریش کے علاوہ دوسروں میں نہیں جانیں گے۔ (مصنف عبد الرزاق، 231/5) خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

الملک في قریش والقضاء في الأنصار والأذان في الحبشة والأمانة في الأزد

حکومت قریش میں اور قضا انصار میں اور اذان حبشہ میں اور امانت ازد میں ہے۔

(الترمذی، حدیث نمبر: 3871)

یہاں پر یہ ضروری ہے کہ جس طرح قضا کا استحقاق انصار کے لیے اور اذان کا استحقاق حبشہ کے لیے ثابت کیا جاتا ہے اسی طرح قریش کے لیے امامت و خلافت کے استحقاق کا اقرار کیا جائے۔ اس سے دوسروں کے حقِ خلافت و امامت کا انکار ثابت نہیں ہوتا، جیسے کہ انصار کے علاوہ دوسروں کی قضا کا انکار نہیں، اس لیے ملا علی قاری فرماتے ہیں:

أقول وفیہ إشعار بأن الخلق لا ینفون عن مبایعتھم أن قابلیة المتبوعیة مجبولة في جبلتھم فینبغي أن لا یخرج عنھم أمر الخلافة لئلا یترتب علیہ المخالفة

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث (الناس تبع لقریش إلخ) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ قریش کی تابعداری سے نفرت نہیں کریں گے، اور پیشرو اور خلیفہ ہونے کی قابلیت ان کی سرشت میں رکھی گئی ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان سے خلافت کا امر نکالا نہ جائے تاکہ اس پر مخالفتیں نہ پیدا ہوں۔

اور اگر اس خبر کو اپنے معنی ہی میں لیا جائے یعنی نفس امامت حفظ قریش کے لیے ہے، دوسروں کے لیے نہیں تو یہ پیش گوئی جناب رسول علیہ السلام کی ایک خاص زمانہ تک کے لیے ہے۔ چنانچہ خود علامہ سیوطی اور علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ اس کی تصریح فرما رہے ہیں اور جبکہ لفظ ما أقاموا الدین خود بخاری کی روایت میں موجود ہے، تو پھر اس تخصیص کی بھی ضرورت نہیں، جب تک قریش نے حقوق واجبہ رعایت کی خداوند کریم نے ان میں بادشاہت اور خلافت رکھی اس کے بعد چھین لی۔

بہت سے علمائے حدیث و فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس حدیث کو خبر بمعنی امر فرما رہے ہیں جس کا رخ فقط اس خلیفہ کی جانب ہوگا، جس کو امت نے باہمی مشورے سے خلیفہ بنایا ہو یا سابق خلیفہ نے اس کو ولی عہد کے طور پر خلیفہ مقرر کیا ہو،

لیکن اگر کوئی شخص اپنی قوت اور سطوت سے خلیفہ ہو جائے تو اس کے لیے قریشیت وغیرہ شرط نہیں۔ ایسے امام کی اطاعت اور اعانت اسی طرح واجب رہے گی، جیسے کہ اس امام کی جس میں خلافت کی تمام شرائط موجود تھیں۔ تمام فقہی مصادر میں اس کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جدید قومی ریاست اور جہاد :۱۰

آج کل دنیا میں جتنی بھی ریاستیں ہیں وہ قومی ریاستوں کے نام سے موسوم ہیں۔ قومی ریاست کا مطلب یہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر خطے کے ہر ملک کی حدود متعین و محفوظ ہیں۔ ماضی کی طرح کوئی بھی طاقتور ملک کسی کمزور ملک پر قبضہ نہیں کر سکتے اور اس کے جغرافیائی حدود کو چیلنج نہیں کر سکتے جس سے بہر حال کمزور ممالک طاقتور ممالک کے قبضے سے محفوظ ہیں۔

مگر یہاں پر جدید قومی ریاست کے بارہ میں ایک بہت اہم بنیادی احساس اور سوال جو کہ ہمارے مذہبی اذہان میں بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ ہے کہ اس تصور کو قبول کرنا در حقیقت جہاد کی تنسیخ کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے، جو اسلامی تصور حکومت واقتدار کا ایک جزو لاینفک ہے، اس کی تشریح اس طرح ہے کہ اسلامی شریعت میں مسلمان ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اعلی کلمۃ اللہ کے لئے چند ضروری شرائط کے ساتھ ارد گرد کے علاقوں میں قائم غیر مسلم حکومتوں کے خلاف جنگ کر کے یا تو ان کا خاتمہ کر کے ان علاقوں کو مسلمان ریاست کا حصہ بنائے یا کم سے کم انہیں اپنے تابع کر کے جزیہ دینے پر مجبور کر دے۔ قومی ریاست کے جدید تصور میں ظاہر ہے کہ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اپنی جغرافیائی حدود میں سیاسی خود مختاری کو ہر قومی ریاست کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی ریاست کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بھی بنیاد پر دوسری ریاست کی جغرافیائی حدود یا انتظام کار میں براہ راست مداخلت کرے، یوں جہاد اور قومی ریاست میں گویا تباہی کی نسبت پائی جاتی ہے۔

تاہم مذہبی فکر کو اس عملی حقیقت کا بھی ادراک ہے کہ موجودہ عہد میں معاشروں کی بقا سر تا سر قومی ریاست کے تصور پر منحصر ہے، اس لئے جہاں یہ سوال اہم ہے کہ قومی ریاست میں جہاد کا امکان باقی رہتا ہے یا نہیں وہاں یہ سوال بھی اتنا ہی ہے کہ اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اگر قومی ریاست کے تصور کو کالعدم کر دیا جائے تو بحالت موجودہ معاشروں کی نفس بقا کیسے ممکن ہو گی۔

یہ معلوم ہے کہ دور جدید میں نہ صرف استعمار (یعنی طاقت کے زور پر بالادست قوموں کے کمزور قوموں پر مسلط ہونے کے عمل) کا خاتمہ قومی ریاست کے تصور کے تحت ہی ممکن ہوا ہے، بلکہ طاقتور قوموں کے جنگ وجدل اور خون ریزی کا سلسلہ بھی اسی اصولوں کو قبول کر لینے کی بدولت ہی رکا ہوا ہے۔

مزید برآں طاقتور قوتوں کے جواز میں قائم چھوٹ چھوٹے ممالک بھی اگر ایک سطح پر انفرادیت خودارادی سے بہرہ ور اور اپنے زور آور پڑوسیوں کے براہ راست چیرہ دستی سے محفوظ ہے تو اس کے پیچھے بھی قومی ریاست کے احترام کا ہی اصول کار فرما ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو جدید قومی ریاست کے تصور کے اس احترام کی وجہ سے زیادہ تر فائدہ مسلم ممالک کو ہو رہا ہے کیونکہ آج کل اکثر و بیشتر کمزور ممالک میں مسلمان ریاستیں ہی سر فہرست ہیں۔ چنانچہ خدانخواستہ آج اگر اسی اصولوں کے حوالے سے بین الاقوامی اتفاق رائے ختم ہو جائے تو ایک نئی جنگ عظیم کا شروع ہو جانا ہفتوں یا دنوں کی نہیں بلکہ لمحوں کی بات ہے، اور اس سارے فساد میں خاص طور پر کمزور اور پسماندہ قومیں جس تباہی سے دوچار ہوں گی اس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال یہ ایک عجیب صورتحال ہے ہماری مذہبی فکر کے سامنے میں جس کے عموماً علما کرام دو طرح کے جوابات دیتے ہیں،

کہ قومی ریاستوں کے تصور کو قبول کرنا بادل نخواستہ اور بامر مجبوری ایک وقتی اور عارضی طور پر صورتحال کہ طور پر قبول کیا گیا ہے، جب تک یہ عملی رکاوٹ موجود ہو اس وقت تک جہاد کی عملی طور پر کرنا معطل کیا جائے گا

لیکن اسے کوئی مستقل اور معیاری اصول نہ مانا جائے۔

دوسرا جواب یہ کہ آج کے دور میں جہاد کا تصور مختلف ہو گیا ہے کہ براہ راست جغرافیائی حدود میں دخل اندازی کی بجائے معاشی اور سائنسی ایجادات اور ترقی کے ذریعے جہاد کرے اور غیر مسلم پر اپنا اثر ورسوخ بڑھائے۔ بہر حال اس دور میں اہل علم اور دانشور ملت کے لئے یہ ایک اہم سوال ہے کہ ہم کس طرح اس صورتحال سے پیش آئے۔

فصل سوم: قومی اور بین الاقوامی قوانین اور اسلام

قانون وضعی کی حیثیت

کسی قانون کے حوالے سے جب بات ہوتی ہے تو بعض حضرات یہ دلیل دیتے ہیں کہ اصل قانون قرآن وسنت ہے اور انسانوں کا بنا قانون شرک فی الحکم ہے، لہذا اگر انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو لازماً شرک فی الحکم سمجھا جائے تو پھر یہی حکم خلفائے بنوامیہ سے لے کر عثمانی خلفاء تک سب حکمرانوں کے جاری کردہ فرامین اور وضع کردہ قواعد کو بھی دینا ہو گا۔

ہر قانونی نظام میں صحیح (Valid) اور غیر صحیح (Invalid) قوانین میں فرق کے لیے قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ مثلاً پارلیمنٹ کسی موضوع پر قانون سازی کے لیے بنیادی قواعد ایک قانون کے ذریعے طے کر دیتی ہے جو Parent Act کہلاتا ہے۔ اس ایکٹ کے ذریعے کسی دوسرے ادارے کو قانون سازی کے اختیارات تفویض (Delegate) کر دیے جاتے ہیں۔ وہ ادارہ جو قوانین وضع کرتا ہے اگر وہ Parent Act کے وضع کردہ قواعد کی رو سے صحیح ہوں تو انھیں ملک کے قانونی نظام کا حصہ سمجھا جائے گا، باوجود اس کے کہ ان قوانین کو پارلیمنٹ کے بجائے ایک ماتحت ادارے نے وضع کیا ہوتا ہے۔ پھر ہر قانونی نظام میں ایک اساسی قاعدہ (Grundnorm) ہوتا ہے جو خود صحیح ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر دیگر تمام قوانین کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اسلامی قانون کا بنیادی قاعدہ ہے کہ: ان الحکم الا اللہ (یوسف: ۴۰)

پس وضعی قوانین کو الہامی نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن وہ اسلامی قانون ہی کا حصہ ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مذکورہ بالا قاعدہ کی رو سے صحیح ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا تعزیری سزاؤں کا ذکر کتاب الحدود میں ہی کرتے ہیں۔ جب قرآن وسنت نے اس طرح کے معاملات میں قانون سازی کا اختیار اولی الامر کو دیا ہے تو پھر اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ وضعی قوانین پر یہ شبہ یقیناً وزنی ہے کہ وہ اسلامی قانون کے بجائے انگریزوں کے وضع کردہ قوانین سے ماخوذ ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ پاکستان میں قانون ساز اداروں اور شعبہ قانون سے وابستہ بعض افراد کا موقف یہ

ہے کہ جو قوانین قرآن وسنت سے "متصادم" نہیں ہیں وہ از خود صحیح ہیں۔اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ اسلامی قانون کے قواعد عامہ نظرانداز کر دیے جاتے ہیں بلکہ "عدم تصادم" کو "مطابقت" کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔

فقہانے اسلامی قانون کا جو ڈھانچہ بنایا ہے اس میں ہر قسم کا قانون ایک خاص قسم کے حق کے ساتھ منسلک ہے۔ان حقوق میں باہم ترجیح کے لیے فقہانے خاص اصول بھی وضع کیے ہیں۔جب تک حقوق کے اس نظام کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے،اسلامی قانون کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں برقرار رہیں گی۔اس ڈھانچے میں ہر قانون کا تعلق یا تو اللہ کے حق سے ہوتا ہے یا بندے کے حق سے جسے حق العبد کہتے ہیں۔ بعض اوقات قانون کا تعلق ریاست یا معاشرے کے حق سے ہوتا ہے جسے حق السلطان یا حق السلطنۃ کہتے ہیں۔ حق جس کا ہوتا ہے اسے جرم کی معافی کا بھی اختیار ہوتا ہے اگر حقوق اللہ اور حقوق السطان ایک ہی ہوتے (جیسا کہ کئی معاصر اہل علم نے فرض کیا ہے) تو پھر جن جرائم کو حقوق اللہ سے متعلق سمجھا جاتا ہے (حدود) ان میں ریاست کے پاس معافی کا اختیار ہوتا۔اسی طرح حق کے مختلف ہونے کی وجہ سے جرم کے ثبوت اور بعض دیگر متعلقہ مسائل (مثلاً شبہ کا اثر) بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات دو قسم کے حقوق مل کر ایک مشترک حق بناتے ہیں۔

ایسے جرائم جن کا تعلق حق السلطان سے ہے اور جن کی سزا کی مقدار کا تعین بھی اولی الامر (حکمرانوں) کے ذمے ہے،ان کو فقہائے احناف "سیاسۃ" جرائم کہتے ہیں۔ان جرائم میں معیار ثبوت کا تعین بھی حکومت کے پاس ہے اور معافی کا اختیار بھی وہ رکھتی ہے، جرم کی نوعیت کے مطابق سزا کا تعین حکومت کرتی ہے اور اس سلسلے میں ایسی کوئی قید نہیں ہے کہ سزا حد کی مقدار سے زائد نہ ہو۔ چنانچہ بعض حالات میں سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔

پارلیمانی نظام حکومت اور قانون:

پارلیمانی نظام حکومت یقیناً آمریت، بادشاہت یا غلبہ کے طریق کار سے بدرجہا بہتر ہے۔ پارلیمانی نظامِ حکومت میں کیا پارلیمنٹ ہر قسم کی قانون سازی کر سکتی ہے؟ کیا اس کا یہ اختیار مطلق ہے؟ مغرب میں اقتدار اعلیٰ کے متعلق جو بحثیں ہوئیں،ان کے نتیجے میں پہلے نظری سطح پر یہ بات مان لی گئی کہ اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہے۔انتخاب کی صورت میں وہ یہ اختیار اپنے نمائندوں کو تفویض کر دیتے ہیں۔تاہم اس تفویض کے عمل سے دو باتیں از خود ثابت ہو جاتی ہیں: ایک یہ کہ جن کو اختیار تفویض کیا گیا وہ مطلق اختیار کے حامل نہیں ہیں؛ دوسری یہ کہ جنھوں نے اختیار تفویض کیا وہ بھی مطلق اختیار کے حامل نہیں رہے۔ بالفاظِ دیگر اقتدار اعلیٰ کسی کے پاس نہیں رہا۔

اب یہ بات صرف کاغذات تک ہی محدود ہے کہ پارلیمنٹ اقتدار اعلیٰ کی حامل ہے، حقیقت یہ ہے جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا کہ ریاست بھی اقتدار اعلیٰ کی حامل نہیں ہے چہ جائیکہ پارلیمنٹ! برطانیہ کے نظامِ حکومت کو پارلیمانی نظام حکومت کی سب سے بہترین مثال سمجھا جاتا ہے لیکن وہاں بھی پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا تصور ختم ہوتا جارہا ہے اور اس کی جگہ "کابینہ کی آمریت" کے تصور نے جنم لیا ہے۔امریکا میں جہاں عدالتوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کانگریس کے وضع کردہ قانون کو ختم کر سکتی ہے،وہاں کانگریس کے بجائے آئین کی بالادستی کی بات کی جاتی ہے، جس کی محافظ عدالت عظمیٰ ہے۔اسی طرح عدالت عظمیٰ کو اختیار دیا گیا کہ وہ صدر کے جاری کردہ فرامین کو بھی کالعدم قرار دے۔تاہم کانگریس

آئین میں ترمیم کر سکتی ہے۔ جو اگرچہ ایک نہایت مشکل کام ہے لیکن بہر حال اس کا اختیار کانگریس کے پاس ہے۔ اس طرح کانگریس عدالت کے اختیارات کو محدود کر سکتی ہے، کانگریس کے اس اختیار پر ایک قدغن لگانے کے لیے سربراہ ریاست، یعنی صدر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کانگرس کے منظور کردہ قانون کو ویٹو کے اختیار کے استعمال کے ذریعے مسترد کر دے۔ بھارت میں پارلیمنٹ کے اس اختیار کو مزید محدود کر دیا گیا ہے کہ وہ آئین میں اس طرح کی ترمیم نہیں کر سکتی کہ اس سے آئین کا بنیادی ڈھانچہ ہی تبدیل ہو جائے۔ پس "قانون سازی کے مطلق اختیار" کا وجود کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک تخیل اور وہم ہے۔

بین الاقوامی قانون کی حیثیت

بین الاقوامی قانون کے متعلق یہ تصور رہا ہے کہ اس کا نفاذ ریاست کی مرضی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ ریاست اقتدار اعلیٰ کی حامل ہے اس لیے اس پر بالادست قانون کوئی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ بالادستی کا مطلب ریاست کے اقتدار اعلیٰ کی نفی ہے، تاہم اقتدار اعلیٰ کا حامل شخص خود اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کر سکتا ہے، چنانچہ بین الاقوامی قانون ان پابندیوں کا مجموعہ ہے جو ریاست نے اپنے اوپر صراحتاً یا دلالتاً عائد کی ہیں۔ اول الذکر کو معاہدہ اور ثانی الذکر کو رواج کہتے ہیں۔ تاہم یہ انتہائی حد تک سادہ موقف اب بالکل متروک ہو چکا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا، ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا تصور صرف اعلان کی حد تک محدود رہ گیا، اس کے قانونی اثرات باقی نہیں رہے۔ مزید برآں جب ریاست رواج یا معاہدے کی دفعات پر عمل کی پابند ہو گئی تو وہ اقتدار اعلیٰ کی حامل باقی نہیں رہی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے ضابطے میں تصریح کی گئی ہے کہ بین الاقوامی قانون کے مآخذ میں محض رواج اور معاہدات ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ بین الاقوامی عدالتوں کے فیصلوں اور ممتاز ماہرین قانون کی تحریرات کے علاوہ مہذب اقوام کے نظامہائے قانون کے مسلمہ قواعد اور اصول بھی شامل ہیں، ان ماخذ میں کچھ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ بنیادی، تاہم اتنی بات طے ہے کہ ان سب کا ماخذ ریاست کا اقتدار اعلیٰ نہیں ہے۔

شریعت نے دارالاسلام اور دارالکفر کے درمیان جنگ و امن کے تعلقات کی تہذیب کے لیے کچھ قوانین نصوص کے ذریعے دیے ہیں اور دیگر امور کے لیے سیاسۃ کے قاعدے کے تحت حاکم کو اختیار دے دیا ہے، مسلمانوں کے لیے شریعت کے احکام ہر صورت میں واجب الاطاعت رہیں گے خواہ فریق مخالف ان کو مانے یا نہ مانے، اور خواہ وہ ان کی پابندی کرے یا خلاف ورزی۔ ہاں اگر فریق مخالف بھی ان امور کی پابندی پر آمادہ ہے اور ان کو معاہدات کے ذریعے منضبط کرنا چاہتا ہے تو یہ اور بھی بہتر ہے۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی نے السیر الکبیر میں کئی ایسے فرضی معاہدات پر بحث کی ہے جو مسلمان دیگر اقوام کے ساتھ آداب القتال کے سلسلے میں کر سکتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ "یہ معاہدہ نہیں بلکہ قانون ہے لہٰذا جائز ہے" ایک انتہائی حد تک غلط موقف ہے کیوں کہ جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا، محض قانونی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے یہ ناجائز نہیں ہو جاتا، بالخصوص جبکہ اس معاہدے میں وہی کچھ طے کیا گیا ہو جو شریعت نے مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہو۔

باقی رہی یہ بات کہ اگر معاہدے میں کوئی شق شریعت کے خلاف ہو تو کیا اس معاہدے پر دستخط کرنا ناجائز نہیں ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خلاف شریعت کسی شرط کا ماننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے (المسلمون عند شروطھم الا شرطاً أحل حراماً أو حرم حلالا) اس قسم کی شرط

ماننا یقیناً ناجائز ہے، بلکہ اگر اس قسم کی شرط مان بھی لی گئی تو اس پر عمل ناجائز ہوگا، تاہم بعض شرائط کے مقتضیات کے تعین پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بعض شروط کے ماننے سے بعض لوگوں کے نزدیک کفر کی بالادستی ماننی لازم آتی ہو، جبکہ بعض دوسرے لوگوں کے خیال میں ہو سکتا ہے کہ یہ ان شروط کے ماننے کا لازمی تقاضا نہ ہو۔ اس لیے کوئی مجہول بیان دینا مناسب نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہوگا کہ ہر ہر شرط کے مقتضیات پر الگ الگ بحث کی جائے اور پورے معاہدے کے مجموعی اثر پر اس کے بعد نظر ڈالی جائے، اس کے بعد ہی اس معاملے کی صحیح شرعی تکییف کی جا سکے گی۔ عقود اور شروط کے متعلق اصل صحت، نفاذ اور لزوم کا ہے۔ جو شخص دعویٰ کرے کہ کوئی شرط یا عقد اس اصل کے خلاف ہے تو ثبوت کا بار بھی اسی کے ذمے ہے۔

پچھلے مباحث کی روشنی میں یہ امر اصولی طور پر بالکل جائز ہے کہ مسلمان دیگر اقوام کے ساتھ مل کر ایسا معاہدہ کریں جس کے ذریعے وہ آپس کے تنازعات کے حل کے لیے کوئی پرامن طریقہ متعین کریں۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے فریق کے خلاف باہمی تعاون بھی اصولی طور پر جائز ہے۔ البتہ تفصیلات اور جزئیات پر بحث کی ضرورت ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر دو گروہوں کے درمیان تنازعہ ہو اور ہمیں کسی ایک فریق کا ساتھ دینا پڑے تو کیا ہم اس بنیاد پر فیصلہ کریں گے کہ ان گروہوں میں مسلمان کون ہے؟ یا یہ دیکھیں گے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ اگر ظالم اور مظلوم کے سوال کو نظر انداز کر کے ہم ہر حال میں صرف "مسلمان" ہی کا ساتھ دیں تو کیا یہ اسی طرح کی "قوم پرستی" نہیں ہو جائے گی جس پر مسلمان اہل علم عموماً تنقید کرتے ہیں۔

باب چہارم: اسلامی حکومت کے بنیادی اُصول

فصل اول: بنیادی اصول اور قرارداد مقاصد

اسلامی حکومت کے بنیادی اصول
۱۹۵۱ میں جملہ مکاتبِ فکر کے متفقہ نکات

قیامِ پاکستان سے ہی اسلامی دستورِ مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اُصول کیا ہیں اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اُصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علما متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس ابہام میں ان مختلف آئینی تجاویز نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے ہی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علماء کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی آئین کے بنیادی اُصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ ان اُصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول بھی ہو۔

اس غرض کے لیے کراچی میں بتاریخ ۱۴، ۱۳، ۱۲ اور ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ بمطابق ۲۲، ۲۱، ۲۳ اور ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء بصدارت مولانا سید سلیمان ندوی ایک اجتماع منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی آئین کے جو بنیادی اُصول بالاتفاق طے ہوئے وہ درج ذیل ہیں:

اسلامی مملکت کے بنیادی اُصول

اسلامی مملکت کے آئین میں حسبِ ذیل اُصول کی تصریح لازمی ہے:

1. اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔
2. ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا، جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

3. (تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب وسنت کے خلاف ہو، تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک مُعیَّنہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں گے۔

4. مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اُصول و مقاصد پر مبنی ہو گی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

5. اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کر کے منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیا اور مُسلّمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

6. اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانان عالم کے ساتھ رشتۂ اتحاد واخوّت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی و لسانی علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ واستحکام کا انتظام کرے۔

7. مملکت بلاامتیازِ مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی ابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہو گی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

8. باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

9. مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعہ، صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

10. مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہو گا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہو گا کہ انھیں کے قاضی یہ فیصلہ کریں۔

11. غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہو گی اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہو گا۔

12. غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدودِ شریعت کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں، ان کی پابندی لازمی ہو گی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبرے میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

13. رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدیُّن، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر ان کے جمہوری منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

14. رئیس مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے خیالات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

15. رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں، بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

16. رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ آئین کو کُلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

17. جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی، وہی کثرتِ آرا سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

18. رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

19. ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

20. محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا، تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

21. ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی، جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

22. ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزائے انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسل، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں محض انتظامی علاقوں کی ہوگی، جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

23. آئین کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس

1. (علامہ) سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)
2. (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)
3. (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف، ریاست قلات)
4. (مولانا) محمد بدر عالم (اُستاذ الحدیث، دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد، ٹنڈو الہ یار، سندھ)
5. (مولانا) احتشام الحق تھانوی (مہتمم دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد، سندھ)
6. (مولانا) محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان، سندھ)
7. (مفتی) محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)
8. (مولانا) محمد ادریس (شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور)

9. (مولانا) خیر محمد (مہتمم، مدرسہ المدارس، ملتان شہر)
10. (مولانا مفتی) محمد حسن (مہتمم مدرسہ اشرفیہ، نیلا گنبد، لاہور)
11. (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف، سرحد)
12. (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر، دار العلوم الاسلامیہ، اشرف آباد، سندھ)
13. (حاجی) خادم الاسلام محمد امین (خلیفہ حاجی ترنگ زئی، المجاہد آباد، پشاور صوبہ سرحد)
14. (قاضی) عبد الصمد سربازی (قاضی قلات، بلوچستان)
15. (مولانا) اطہر علی (صدر عامل جمعیۃ علمائے اسلام، مشرقی پاکستان)
16. (مولانا) ابو جعفر محمد صالح (امیر جمعیت حزب اللہ، مشرقی پاکستان)
17. (مولانا) راغب احسن (نائب صدر جمعیۃ العلما اسلام، مشرقی پاکستان)
18. (مولانا) محمد حبیب الرحمن (نائب صدر جمعیۃ المدرسین، سرسینہ شریف، مشرقی پاکستان)
19. (مولانا) محمد علی جالندھری (مجلس احرارِ اسلام پاکستان)
20. (مولانا) داؤد غزنوی (صدر جمعیۃ اہلحدیث، مغربی پاکستان)
21. (مفتی) جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
22. (مفتی حافظ) کفایت حسین مجتہد (ادارہ عالیہ تحفظِ حقوقِ شیعہ پاکستان لاہور)
23. (مولانا) محمد اسماعیل سلفی (ناظم جمعیت اہلحدیث پاکستان گوجرانوالہ)
24. (مولانا) حبیب اللہ (جامعہ دینیہ دار الہدیٰ، ٹیڑھی، خیر پور میر)
25. (مولانا) احمد علی (امیر انجمن خدام الدین، شیر انوالہ دروازہ، لاہور)
26. (مولانا) محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، کھڈہ، کراچی)
27. (پروفیسر) عبد الخالق (رکن بورڈ آف تعلیماتِ اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
28. (مولانا) شمس الحق فرید پوری (صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم، ڈھاکہ)
29. (مفتی) محمد صاحبداد عفی عنہ (سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی)
30. (مولانا) محمد ظفر احمد انصاری (سیکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
31. (پیر صاحب) محمد ہاشم مجددی (ٹنڈو سائیں داد، سندھ)

قراداد مقاصد کا مکمل متن

(یہ قرارداد 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی۔ یہ قرارداد پاکستان کے آئین کے لیے رہنما اصول متعین کرتی ہے۔)

- اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے۔ اس نے جمہور کے ذریعے مملکتِ پاکستان کو جو اختیار سونپا ہے، وہ اس کی مقررہ حدود کے اندر مقدس امانت کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔
- مجلس دستور ساز نے جو جمہور پاکستان کی نمائندہ ہے، آزاد و خود مختار پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
- جس کی رو سے مملکت اپنے اختیارات و اقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔
- جس کی رو سے اسلام کے جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں کا پورا اتباع کیا جائے گا۔
- جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو قرآن و سنت میں درج اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق ترتیب دے سکیں۔
- جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں، اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھنے، عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دینے کے لیے آزاد ہوں۔
- جس کی رو سے وہ علاقے جو اب تک پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں، ایک وفاق بنائیں گے * جس کے صوبوں کو مقررہ اختیارات و اقتدار کی حد تک خود مختاری حاصل ہو گی۔
- جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی اور ان حقوق میں جہاں تک قانون و اخلاق اجازت دیں، مساوات، حیثیت و مواقع کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور جماعت کی آزادی شامل ہو گی۔
- جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقات کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا۔
- جس کی رو سے نظامِ عدل گستری کی آزادی پوری طرح محفوظ ہو گی۔
- جس کی رو سے وفاق کے علاقوں کی صیانت، آزادی اور جملہ حقوق، بشمول خشکی و تری اور فضا پر صیانت کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و بہبود کی منزل پا سکیں اور قوام عالم کی صف میں اپنا جائز و ممتاز مقام حاصل کریں اور امن عالم اور بنی نوع انسان کی ترقی و خوش حالی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

فصل دوم: ووٹ کی شرعی حیثیت

آج کی دنیا میں اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل وارڈوں اور دوسری مجالس اور جماعتوں کے انتخابات میں جمہوریت کے نام پر جو کھیل کھیلا جارہا ہے کہ زور وزر اور غنڈا گردی کے سارے وسائل کا استعمال کرکے یہ چند روزہ موہوم اعزاز حاصل کیا جاتا ہے اور اس کے عالم سوز نتائج ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ملک وملت کے ہمدرد و سمجھ دار انسان اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کی فکر میں بھی ہیں، لیکن عام طور پر اس کو ایک ہار جیت کا کھیل اور خالص دنیاوی دھندا سمجھ کر ووٹ لیے اور دیے جاتے ہیں۔ لکھے پڑھے دین دار مسلمانوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ یہ کھیل صرف ہماری دنیا کے نفع نقصان اور آبادی یا بربادی تک نہیں رہتا بلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت و معصیت اور گناہ و ثواب بھی ہے جس کے اثرات اس دنیا کے بعد بھی یا ہمارے گلے کا ہار عذابِ جہنم بنیں گے، یا پھر درجاتِ جنت اور نجاتِ آخرت کا سبب بنیں گے۔

اگرچہ آج کل اس اکھاڑے کے پہلوان اور اس میدان کے مرد، عام طور پر وہی لوگ ہیں جو فکرِ آخرت اور خدا اور رسولؐ کی طاعت و معصیت سے مطلقاً آزاد ہیں اور اس حالت میں اُن کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام پیش کرنا ایک بے معنی وعبث فعل معلوم ہوتا ہے، لیکن اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی۔ ہر زمانے اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پر قائم رہتے ہیں جن کو اپنے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر اور خدا اور رسولؐ کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے۔ نیز قرآن کریم کا یہ بھی ارشاد ہے: وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ○ (الذّٰریٰت ۵۵:۵۱)

یعنی آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں اُمیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور اُن کی اہمیت کو قرآن وسنت کی رُو سے واضح کردیا جائے۔ شاید کچھ بندگانِ خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

امیدوار

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے جو اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے۔ ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا اُمیدوار ہے، دوسرے یہ کہ وہ دیانت وامانت داری سے اس کام کو انجام دے گا۔ اب اگر واقعی میں وہ اپنے اس دعوے میں سچا ہے، یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا تو اس کا یہ عمل درست ہے۔ البتہ بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کردے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں، وہ اگر اُمیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے۔ اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک وملت کے لیے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غدار و خیانت کا مجرم ہو کر عذابِ جہنم کا مستحق بن جائے گا۔ اب ہر

وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے اور یہ سمجھ لے کہ اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال ہی تک محدود تھی، کیونکہ حدیث کے مطابق ہر شخص اپنے اہل و عیال کا ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلقِ خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے، اُن سب کی ذمہ داری کا بوجھ اُس کی گردن پر آتا ہے اور وہ دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسؤول اور جواب دہ ہے۔

ووٹ اور ووٹر کی مختلف حیثیتیں:

کسی اُمیدوار ممبر اسمبلی کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں۔

ووٹر کی پہلی حیثیت: شہادت

ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت اور امانت بھی۔ اور اگر واقعی میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے، جو سخت کبیرہ گناہ اور وبالِ دنیا و آخرت ہے۔ بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتِ کاذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے (مشکوٰۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم) جس حلقے میں چند اُمیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔ اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع و خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔

دوسری حیثیت: سفارش

یعنی کہ ووٹر اس امیدوار کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے۔ اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (النساء ۸۵:۴)

یعنی (جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اُس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بُری سفارش کرتا ہے تو اُس کی بُرائی میں اُس کا بھی حصہ لگتا ہے)۔

اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلقِ خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، اور بُری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق و ظالم کی سفارش کر کے اُس کو خلقِ خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا اُمیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

تیسری حیثیت: وکالت

ووٹ کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس اُمیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اُس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اُس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لیے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لیے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسری سفارش، تیسری حقوق مشترکہ میں وکالت۔ تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجبِ ثوابِ عظیم ہے اور اُس کے ثمرات اُس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بُری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن اثرات بھی اُس کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

ضروری تنبیہ

مذکور الصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رُو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہِ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثوابِ عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی فرمادیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۵:۸)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ (النساء ۴:۱۳۵) ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لیے ادائیگیٔ شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں۔ تیسری جگہ سورۂ طلاق (۶۵:۱) میں ارشاد ہے:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ، یعنی اللہ کے لیے سچی شہادت کو قائم کرو۔ ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔ ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ، وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرہ ۲:۲۸۳) (یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اُس کا دل گناہ گار ہے)۔

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں، ضرور ادا کریں۔ آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آرہی ہیں اُن کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نیک اور صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدے میں آرہا ہے کہ ووٹ عموماً اُن لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لیے جاتے ہیں اور اُن لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے۔ اس لیے جس حلقے میں کوئی بھی اُمیدوار قابل اور نیک معلوم ہو، اُسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی جرم اور پوری قوم وملت پر ظلم کے مترادف ہے، اور اگر کسی حلقے میں کوئی بھی

اُمیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ معلوم ہو مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیتِ کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیلِ شر اور تقلیلِ ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ نجاست کے پورے ازالے پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیلِ نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیلِ ظلم کو فقہاء رحمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

خلاصہ یہ ہے کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ آپ جس اُمیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم و عمل اور دیانت داری کی رُو سے اس کام کا اہل اور دوسرے اُمیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں۔

خلاصۂ بحث:

اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعے جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا، وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا بُرے اقدامات کرے گا اُن کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی۔ آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۲۔ اس معاملے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے، ثواب و عذاب بھی محدود۔ قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳۔ سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے۔ آپ کے حلقۂ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریے کا حامل و دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے، تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

۴۔ جو اُمیدوار نظامِ اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے، اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہِ کبیرہ ہے۔

۵۔ ووٹ کو پیسوں کے معاوضے میں دینا بد ترین قسم کی رشوت ہے اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں ہو، کوئی دانش مندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ ''وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لیے اپنا دین کھو بیٹھے''۔ (از مفتی اعظم مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ، جواہر الفقہ)

باب پنجم: پاکستان میں جمہوریت: مسائل، امکانات، اور ممکنہ حل

پاکستان میں جمہوریت کا تصور بہت زیادہ فکری گفتگو اور تجزیہ کا موضوع رہا ہے۔ جمہوریت بنیادی طور پر ایک طرزِ حکمرانی ہے۔ یہ حکمرانی کا ایک ایسا ڈھانچہ ہے جو اکثریتی طبقہ کی حکمرانی کے اصول کو تسلیم کرتا ہے اور اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ جمہوریت عوامی عہدہ حاصل کرنے کے لئے انتخابی مقابلہ پر انحصار کرتی ہے اور سیاسی جماعتوں کو مرکزی آلہ کار کی حیثیت سے افراد کے ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں اقتدار کے حصول اور منتقلی کے لئے قانونی حیثیت دیتی ہے۔

اس کی تعریف پر کسی بھی طرح کے اختلاف کے باوجود آج جمہوریت کو کسی بھی ملک اور دنیا پر حکمرانی کا سب سے تسلیم شدہ طریقہ سمجھا جاتا ہے جس کا ثبوت خاص طور پر پچھلی صدی کے نصف حصے کے بعد سے دنیا میں جمہوریت سازی کی تیز لہر میں ملتا ہے۔ جمہوریت کے کم سے کم معیار یہ ہیں:

- مسابقتی، کثیر الجماعتی سیاسی نظام۔
- عالمگیر بالغ رائے دہندگی، یعنی ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق۔
- باقاعدگی سے انتخابات کا انعقاد جو خفیہ بیلٹ، مناسب بیلٹ سیکیورٹی، اور بڑے پیمانے پر ووٹروں کی دھوکہ دہی کی عدم موجودگی کی بناء پر ہوں۔
- انتخابی عمل میں میڈیا اور عام طور پر عام انتخابی مہم کے ذریعے بڑی سیاسی جماعتوں کے لیے عوام تک رسائی۔
- منتخب عہدیداروں کا انتخاب بذریعہ باقاعدگی سے شیڈول کیے گئے منصفانہ اور شفاف انتخابات۔
- شہریوں کو کسی سخت سزا کے خوف کے بغیر سیاسی معاملات کے بارے میں آزادانہ اظہار خیال کرنے کا حق۔
- شہریوں کو ایسوسی ایشن یا جماعتیں بنانے کی آزادی جس میں سیاسی اور مفاداتی گروپ شامل ہیں۔

جمہوریت سرکاری اداروں کے ایک سیٹ سے زیادہ کا نام ہے۔ جمہوریت متعدد قابل فہم معیارات، اقدار، افکار اور عملی طریقوں پر منحصر ہے۔ پاکستان ایک جمہوری ریاست کی حیثیت سے 1947 میں معرضِ وجود میں آیا۔ اس میں جمہوریت کا بالواسطہ یا نمائندہ نظام موجود ہے۔ یہ مسلم ممالک اور ترقی پذیر دنیا کی ان چند ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں لوگوں نے جمہوری پارلیمانی نظام کو اپنانے کے لئے جوش و جذبے اور طاقت کا مظاہرہ کیا ہے اور عوامی تحریکوں کے ذریعہ فوجی آمریت کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

نسلی اور طبقاتی اشرافیہ، مذہبی قوت، مضبوط آمرانہ رجحانات اور طویل فوجی حکمرانی کے باوجود پاکستان کی روایت، تاریخ اور سیاست کی ایک پائیدار خصوصیت جمہوریت سے لگاؤ ہے۔ تاہم اس میں کوئی دو رائے نہیں ہیں کہ پاکستان میں ثقافتی اور ساختیاتی حالات جمہوری عمل اور جمہوری اداروں کے فروغ کے خلاف بہت زیادہ وزن رکھتے ہیں۔ اگرچہ ملک میں سول سوسائٹی فروغ پا چکی ہے لیکن متعدد غیر سرکاری گروہوں، باضابطہ انجمنوں، انسانی حقوق کی تنظیموں اور خود مختار اداروں، جو ان گزشتہ سالوں میں ابھر کر سامنے آئے ہیں، کے باوجود کمزور نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی جماعتوں کا سائز اور پیمانہ بھی بڑھ گیا ہے۔

حالانکہ 1977 سے 1988 تک طویل فوجی حکمرانی نے جمہوری اصولوں کو ختم کیا اور جمہوری اقدار کو دبا دیا مگر ملک میں جمہوریت کی آرزو ابھی بھی برقرار ہے۔ 1988 سے 1999 تک تقریباً ایک دہائی تک پاکستان نے پارلیمانی جمہوریت کی منتقلی کو برقرار رکھا۔ یہ سویلین کی زیر قیادت حکومتوں کا سب سے طویل عرصہ رہا ہے لیکن اس مدت میں منتخب حکومتوں میں سے کسی نے بھی اپنے عہدے کا پانچ سالہ دور پورا نہیں کیا ہے۔ 2013 میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک سویلین کی زیر قیادت حکومت سے دوسری سویلین والی حکومت کو اقتدار منتقل کیا گیا۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ انتخابی مسابقت کے اصول کو تقویت ملی ہے اور انتخابی طریقہ کار نے استحکام حاصل کیا ہے۔ 1988، 1990، 1993، اور 1996 میں صدارتی مداخلت کے ساتھ اسمبلیوں کو تحلیل کرنے کے باوجود پاکستان میں جمہوری طرزِ حکومت برقرار ہے۔ مذکورہ بالا تمام تبدیلیوں کی وجہ سے ہی پاکستان میں جمہوریت کو متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے اداروں کا عدم توازن، سیاسی اتفاق رائے کی تعمیر کا فقدان، کمزور سیاسی جماعتیں اور آمرانہ حکومتیں۔ مزید یہ کہ متعدد معاشی و اقتصادی وجوہات بھی پاکستان کے جمہوری عمل میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔

کے کے عزیز اپنی کتاب میں پاکستان میں سیاسی رجحانات کے بارے میں لکھتے ہیں: "پاکستان کی سیاسی تاریخ اور اب تک جس طرح سے سیاست کا کھیل کھیلا گیا ہے اس نے جمہوری روح کو کمزور کرنے اور آمریت کے بھوت کی مضبوطی کو یقینی بنایا ہے۔" لکھاریوں نے ایسے مختلف چیلنجوں کا حوالہ دیا ہے جو ایک ملک میں جمہوریت سازی کے عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ پاکستان میں موجودہ ماحول سے ان عوامل کی مطابقت پر تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے تاکہ اس کی مایوس کن جمہوری کارکردگی کی وضاحت حاصل کی جا سکے۔

سماجی و ثقافتی ترقی کے عوامل:

سماجی معاشی ترقی کو اکثر اہم عنصر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو معاشروں کو جمہوری طرز حکومت کی طرف راغب کرتا ہے۔ مختلف سماجی معاشی اشاریوں میں پاکستانی معاشرے کا سماجی معاشی اشاریہ غیر اطمینان بخش ہے جس میں مجموعی طور پر محدود فی کس آمدنی، شرح

خواندگی اور صحت کے اشاریے شامل ہیں۔ خاندانی قیادت کا کرشمہ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے لوگوں میں مقبول عام ہے۔ پاکستان کے لوگوں میں خواندگی کی سب سے کم شرح نے ان کے لئے صحیح انتخاب کے فیصلے میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ ان کا انتخاب ان کے جذبات اور قائدین کی شخصیت کے دلکشی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ تعلیم کی کمی اور قیادت کا فقدان سیاسی عدم استحکام میں دو اہم کردار ادا کرنے والے عوامل ہیں۔ پاکستان کا تجربہ اس بات کا ثبوت ہے کہ معیاری تعلیم کے بغیر سیاسی نظام اور قیادت کا معیار اور استحکام ممکن نہیں ہے۔

جمہوریت سازی کے عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے ثقافت کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جمہوریت عام طور پر ایک ایسے معاشرے میں گہری جڑیں پکڑتی ہے جس کی ایک مضبوط سیاسی شناخت ہو اور شہریوں میں ایک وابستگی کا احساس ہو جو دیگر وفاداریوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ زیر بحث آیا ہے کہ تکثیری معاشروں میں زبان، مذہب، اور نسل کے حساس مسائل موجود ہیں۔ یہاں قائد کا کردار کسی بھی دوسرے عنصر کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اگر مناسب طریقے سے توجہ نہ دی جائے تو معاشرے میں جمہوری قدروں کو نقصان دینے میں ثقافتی عوامل نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

جیسا کہ پاکستان مختلف ذیلی قومی / نسلی، صوبائی، اور مذہبی / فرقہ وارانہ سطحوں میں تقسیم ہے، تب سے ہی قانونیت اور شناخت کے مسائل شروع ہو گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زور پکڑتے گئے۔ قیادت میں اس ٹوٹ پھوٹ نے شناخت اور قانونی حیثیت کے بحران کو جنم دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مزید خراب ہوتا گیا۔ پاکستان میں مضبوط قومی شناخت کا فقدان ہے اور قبائلیوں، فرقوں اور نسلوں کے ساتھ نسبتاً بہت زیادہ مضبوطی قائم ہے جو جمہوری ثقافت کی نشوونما کو روکتی ہے۔ جمہوریت کو رواداری، دوسروں کے نقطہ نظر کو سننے کے لئے آمادگی اور جمہوری عمل میں کسی ایک فریق کی شکست کی قبولیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انتہا پسندی کی قوتیں، جمود کی سختی سے پابندی اور ضد جو عام طور پر پاکستان کی مقامی آبادیوں میں پائی جاتی ہیں جمہوریت سازی کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

ساختیاتی اور سیاسی چیلنجز:

جمہوری عمل سیاسی متعلقین (سٹیک ہولڈرز) میں اتفاق رائے کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ حکومت کا عدم استحکام، سیاسی جماعتوں کی نا اہلی، اور ایک کمزور سیاسی ثقافت سیاسی طور پر عدم استحکام والی ریاست اور جمہوری عمل میں سست روی کا منظر نامہ تشکیل دیتا ہے۔ سیاسی عدم استحکام خاص طور پر ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔

جمہوریت کے لیے ایک اور بڑا چیلنج پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی کمزور تنظیم سازی ہے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اندرونی طور پر صحیح طور پر منظم نہیں ہیں۔ پارٹی کے اندر انتخابات کی عدم موجودگی اور پارٹی پر کسی خاندان، گروہ یا نسل کے غلبہ کی وجہ سے سیاسی جماعتیں اپنے ووٹروں کے

لحاظ سے پارٹی کے دائرہ کار کو محدود رکھتی ہیں۔ جماعت کے اندر لوگوں کے مخصوص گروہوں کے مفادات اور مقاصد نہ صرف ووٹروں سے محروم کر دیتے ہیں بلکہ جماعت قومی شناخت بھی کھو بیٹھتی ہے۔

اگرچہ جمہوری سیاسی جماعتیں جمہوریت کی بنیادی اکائیاں ہیں، لیکن ان جماعتوں کے اندر مذہبی اور نسلی گروہوں کے پھیلاؤ نے معاشرے میں مزید تقسیم پیدا کر دی ہے۔ ان گروہوں کے اپنے ایجنڈوں اور مفادات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ پارٹی کے اپنے مقاصد کے لئے بھی لوگوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے غیر ضروری پروپیگنڈا بھی کیا جاتا ہے۔

انتظامی سطح پر جمہوریت کو کمزور کرنے والی سب سے بڑی رکاوٹ غیر فعال وفاقی نظام ہے۔ صوبوں اور مرکز کے مابین شراکت داری اور تعاون کے بغیر فیڈریشن کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ مشرقی پاکستان کا منتشر ہونا اور بنگلہ دیش کے طور پر اس کا ابھرنا پاکستان کی تاریخ کا ایک تلخ تجربہ ہے۔ کسی بھی وفاقی ڈھانچے کی کامیابی کے لئے تمام اکائیوں کے ساتھ یکساں سلوک اور باہمی احترام بنیادی ضرورت ہے۔ پاکستان کے جغرافیائی و سیاسی اور سماجی و معاشی ڈھانچے، متنوع ثقافتی روایت اور ایک خطے کے دوسرے خطے سے فاصلے کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان جمہوری اداروں کے ذریعے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ طاقت کو دو فریقوں کے مابین مساوی بنیادوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے اور وفاق کی تمام اکائیوں کے لوگوں کو تعلیم، صحت اور روزگار کے بہتر مواقع میسر آسکتے ہیں۔

اہم معدنیات اور گیس کے ذخائر کے اعتبار سے پاکستان ایک متمول ملک ہے اور وسائل کی آمد و رفت کے لئے اس کے پاس اہم ساحل ہے۔ گرم پانیوں تک رسائی کے لیے اہم دروازہ ہونے کی وجہ سے پاکستان بیرونی طاقتوں کے لئے پرکشش ملک ہے۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک نے اپنے ملکوں کی معاشی ترقی کے بجائے ملک میں قومی اتحاد اور قومی یکجہتی کے مسئلے کو مستحکم کرنے میں زیادہ تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اگر ہم پاکستان کے معاملے پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی نظام میں مستحکم ادارے موجود ہونے پر ہی مناسب معاشی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔

امکانات اور حل:

جمہوریت تعمیرِ قوم کے لئے ایک شرط ہے اور کسی بھی قوم کی تعمیر اس قوم کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری عمل ہے۔ قوم کی تعمیر کا عمل دو سمتوں میں کام کرتا ہے: ایک قوم کی شناخت کی تشکیل کی طرف جس کے نتیجے میں معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور پھر ایک مربوط اور ہم آہنگ معاشرہ ریاست کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے جس میں ریاست کے انتظامی بنیادی ڈھانچے کی ترقی بھی شامل ہے۔ مضبوط جمہوری اداروں اور ثقافت کے نہ ہونے کے نتائج معاشیات، معاشرے اور سیاست کے دائروں میں ہر جگہ محسوس کیے جاتے ہیں۔ لہذا ان چیلنجوں کا حل فراہم کرنے کے لئے مضبوط قیادت اور ایک مثبت جمہوری ثقافت ضروری ہے۔

پاکستان ایک متمول وسائل، ذرخیز زمین، ذہین افراد، اور اہم اسٹریٹجک مقام کے ساتھ ساتھ جوہری طاقت ہونے کے باوجود ایک سخت سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے، جس کی وجہ سے اسے کمزور اور غیر موثر داخلی اور خارجی پالیسی سازی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پالیسیوں کا عدم تسلسل، ایک کم مربوط معاشرہ، اور عالمی سطح پر ایک مبہم تصویر کی وجہ سے دنیا اس کے مستقبل پر سوال اٹھاتی ہے۔ سیاسی طور پر مستحکم ریاست اپنے معاشرے کے ہر طبقے کو ان کی تمام حرکیات میں مطمئن کرتی ہے اور اکثریت کو ایڈجسٹ کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ ریاست کے زیادہ وفادار ہو جاتے ہیں اور ان میں قوم پرستی کا جذبہ قائم ہوتا ہے۔ اور آپس کے اختلافات سے قطع نظر تمام شہری اپنے آپ کو قومی وجود کا ایک حصہ محسوس کرتے ہیں۔

ترقی یافتہ ریاستوں کی مثال اسی تناظر میں دی جاسکتی ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ریاستوں کے معاشرے پاکستان کے مقابلے میں زیادہ تکثیری ہیں جو زیادہ ہم آہنگ ہیں اور قومی اہداف کو یکساں طور پر حاصل کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ مضبوط قیادت ہے جس نے ان معاشروں کی ہیئت کو تشکیل دیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے معاشرے بھی ان نظریات کے مطابق جو وہ چاہتے ہیں کہ حکومت ان کے مطابق ہو اپنی رائے کے ذریعے مدد کرتے ہیں۔ تعلیم کی وجہ سے ترقی یافتہ معاشرے سیاسی طور پر زیادہ شعور رکھتے ہیں اور قومی اہمیت کے معاملات پر واضح رائے رکھتے ہیں۔ سیاست میں تعلیم یافتہ معاشرے کا حصہ واضح طور پر پسماندہ اور کم تعلیم یافتہ معاشرے سے مختلف ہے۔

تعلیم لوگوں کو ریاست کی تعمیر اور ریاست اور معاشرے کے لیے صحتمندانہ کردار نبھانے کے لیے جدوجہد کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ ایک اور اہم عنصر یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ریاستیں اپنے شہریوں کو مخلص قیادت کی وجہ سے تمام بنیادی ضروریات فراہم کرتی ہیں جو پسماندہ معاشروں میں ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔ کسی بھی معاشرے میں سیاسی عدم استحکام کا منفی اثر یہ ہے کہ یہ معاشرے کو مختلف بنیادوں پر تقسیم کرتا ہے کیونکہ معاشرے کے تمام طبقات حکومت کے اقدامات سے مطمئن نہیں ہوتے اور معاشرے میں مجموعی طور پر عدم اعتماد کی صورتحال برقرار رہتی ہے۔ معاشرے کا عدم اطمینان اور عدم اعتماد اسے انفرادی مفادات کے حصول کی طرف لے جاتا ہے جبکہ معاشرہ قومی اور اجتماعی مفادات سے غافل ہو جاتا ہے۔

منفی قوتیں، بیرونی اور اندرونی طور پر، عدم استحکام کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلا سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ پاکستان میں شناخت اور قانونی جواز کے بحرانوں کے تناظر میں سیاسی استحکام کا مسئلہ تیز تر سماجی و سیاسی حرکت کے اثرات اور سول و ملٹری بیوروکریسی کی ضرورت سے زیادہ اور غیر منظم کردار کی وجہ سے بڑھا ہے جس نے ملک کا پورا سیاسی نظام ہلا کر رکھ دیا ہے۔ معاشرتی اور معاشی تبدیلی نے سیاسی تقاضوں کو بھی بڑھا دیا ہے اور سیاسی حصہ داری کو وسیع کر دیا ہے۔ ان تبدیلیوں نے روایتی سیاسی اداروں کو مجروح کیا ہے اور سیاسی جماعتوں اور سیاسی اداروں کی نئی بنیادوں کو قائم کرنے کو کافی حد تک پیچیدہ بنا دیا ہے۔

محدود وسائل کے لیے مختلف کمیونیٹیز کی جانب سے مطالبات میں اضافے اور مسابقت نے صوبوں کے مابین گروہی تقسیم اور تناؤ کو سیاسی بنا دیا ہے۔ان مطالبات کے اضافے کا سیاسی اداروں کا طرف سے مناسب جواب نہ دینے سے بالآخر پاکستان میں شناخت اور قانونی جواز کا بحران پیدا ہوا ہے۔

کسی بھی ریاست میں ایسا بحران بیرونی مداخلت، ریاست مخالف عناصر، اور پریشر گروپس کے لئے اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کو موجودہ چیلنجوں کی وجہ سے معاشرے اور ریاست کے لئے بیرونی اور داخلی مسائل کو جنم دیا ہے۔ پاکستان کو اس وقت خاص طور پر سیاست اور اقتصادیات کے میدانوں میں شدید چیلنجز کا سامنا ہے۔

موجودہ دنیا ایک عالمی دنیا ہے جہاں ہر شعبے میں اس وقت شدید دوڑ اور مقابلہ ہے۔ سیاسی تدبیر، سفارت کاری کا طرز عمل، مؤثر پالیسی سازی اور ایک مضبوط معیشت سب سے اہم چیلنج ہیں جن کا سامنا ہر ریاست کو کرنا پڑتا ہے۔ ماضی میں بھی سیاسی عدم استحکام اور مضبوط جمہوری ثقافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے پاکستان اپنے مشرقی ونگ کی علیحدگی کی صورت میں بھاری نقصان اٹھا چکا ہے اور اس وقت بھی ملک میں صوبوں کے مابین وسائل کی تقسیم کے حوالے سے تنازعات کا شکار ہے۔ تمام وفاقی یونٹ خصوصاً بلوچستان، سندھ اور خیبر پختونخواہ سیاسی عدم استحکام کے سنگین اثرات کا سامنا کر رہے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام کے نتیجے میں قومی سلامتی، سماجی ہم آہنگی، قومی معیشت، دہشت گردی کے خلاف جنگ، پالیسی سازی، عالمی سیاست اور معیشت سے ہم آہنگی، اور عالمی سطح پر حمایت حاصل کرنے کے چیلنجز درپیش ہیں۔ بین الاقوامی دباؤ اور بیرونی مداخلت کی موجودگی میں پاکستان کی قومی سلامتی کو یقینی بنانا ایک چیلنج ہے جس کے ساتھ حکومت کو اس انداز سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے کہ اپنے عوام کے ساتھ ساتھ باقی دنیا کے مفادات بھی پورے ہو سکیں۔

باب ششم: نوجوانوں کی سیاست میں شرکت کی اہمیت اور نوجوان قیادت

ترقی یافتہ اور مستحکم جمہوریت ہمیشہ بڑے پیمانے پر جمہوری کلچر کے فروغ سے ابھرتی ہے۔ محققین کو اب یقین ہے کہ پائیدار اور مؤثر جمہوریت کے لئے بڑے پیمانے پر جمہوری سیاسی کلچر کے فروغ کی اشد ضرورت ہے۔ جمہوری ثقافت یا جمہوری کلچر ایسے شہریوں پر مشتمل ہے جو عوامی معاملات میں سرگرم دلچسپی رکھتے ہیں، اہم واقعات اور فیصلوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور شہری اور سیاسی امور میں حصہ لیتے ہیں۔ شہریوں کی شمولیت سیاسی شراکت داری کے لئے ایک لازمی شرط ہے جو حکومتی پالیسیوں پر اثرانداز ہونے یا ان کو نافذ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ہم آہنگی اور نفاست پسندی کی صلاحیت کا حامل جمہوریت کا ماڈل گذشتہ متعدد ادوار میں تہذیبوں کے لیے غور و خوض کا محور رہا ہے۔ در حقیقت جمہوری تصور اس وقت جمود کا شکار ہے۔ جمہوری اصولوں پر عمل کی پیچیدگیوں کی وجہ سے ان کو آہستہ آہستہ اختیار کیا گیا یا مکمل مسترد کر دیا گیا۔ حالیہ دہائیوں میں نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت کے حوالے سے حکومت، سیاسی جماعتوں، میڈیا، اور ماہرین تعلیم نے کافی زور دیا ہے۔

سیاسی عمل میں شرکت کا مطلب شہریوں کے وہ اقدامات ہیں جس میں وہ حکومتی ڈھانچے، سرکاری افسران کا انتخاب، یا حکومت کی پالیسیوں یا حکومت اور سیاسی عمل کی حمایت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دولتِ مشترکہ یوتھ پروگرام کے مطابق:

> چونکہ دنیا میں بہت ساری قسم کے ترقیاتی عمل، ثقافتیں اور منفرد افراد موجود ہیں لہذا اس میں شراکت کا کوئی ایک رجحان نہیں ہے۔ شراکت کی مختلف تعریفیں ہیں۔ تاہم شراکت کا ایک بنیادی تصور یہ ہے کہ لوگ خود کو سماجی اور ترقیاتی عمل میں شامل کرنے کے لئے آزاد ہوں اور یہ خود کی شمولیت فعال، رضاکارانہ اور باخبر ہو۔ [1]

پاکستان میں نوجوان اور سیاسی عمل میں شمولیت:

پاکستان ایک جمہوری ریاست ہے جہاں ہر شہری کو تعلیم، مناسب معیار زندگی، اور سیاسی قیادت کو منتخب کرنے اور ان پر اثر انداز ہونے کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح نوجوانوں کو بھی کسی بھی دوسری عمر کے شہریوں کی طرح سیاسی عمل میں شرکت کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ ایک قومی حکم نامے کے مطابق انتخابات کے دوران 18 سال یا اس سے زیادہ عمر کے نوجوانوں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دی گئی ہے۔

انجمن دماغی صحت کینیڈا (سی ایم ایچ اے) کے مطابق:

> "نوجوانوں کی سیاسی عمل میں مفید شرکت میں نوجوانوں کی صلاحیتوں، مفادات اور قابلیت کو پہچاننا اور حقیقی مواقعوں کی فراہمی کے ذریعے ان کی پرورش کرنا شامل ہے جو نوجوانوں کو انفرادی اور انتظامی سطح پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں میں شرکت کرنے کے قابل بنائیں۔"

پاکستان کے نوجوان، جو تاریخی طور پر ملک کے سیاسی نظام اور اس کے اداروں کے بارے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں، غیر مخصوص انداز میں پر امید ہیں کہ ان کے انتخاب میں شمولیت اور دلچسپی قوم کو صحیح سمت فراہم کر سکتی ہے۔ الیکشن کمیشن پاکستان کے مطابق 18 سے 35 سال کے درمیان 46 ملین کے قریب ووٹرز نے، جبکہ ان میں سے 18 سے 25 عمر کے 17.44 ملین ووٹرز نے، اس انتخاب میں اپنے ووٹ

---

[1] پاکستان میں نوجوانوں کی سیاسی شرکت کو بڑھانا
https://www.cipe.org/blog/2015/06/25/enhancing-youths-political-participation-in-pakistan/

کاسٹ کیے جس کی وجہ سے نوجوان سیاسی منظر نامے میں ایک اہم قوت کے طور پر سامنے آئے۔ ملک میں 18 سے 30 سال کے درمیان عمر کے اندراج شدہ ووٹرز کی تعداد 35 فیصد ہے، جبکہ 58 فیصد ووٹرز 18 سے 40 سال کی عمر کی حد میں ہیں۔

پاکستان کی 2018 کی نیشنل ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ (این ایچ ڈی آر) نے نوجوانوں میں سماجی زندگی اور جمہوری عمل میں حصہ لینے کے لئے بہت زیادہ جوش اور ولولہ اور رضامندی کو بیان کیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سیاست اور سیاسی قیادت کے منفی خیالات کے نتیجے میں نوجوانوں میں سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا ہے جو آئندہ انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے خواہاں ہیں۔ این ایچ ڈی آر کے مطابق نوجوانوں کی مصروفیات میں یہ تبدیلی سب سے پہلے 2013 کے عام انتخابات میں اس وقت ظاہر ہوئی جب نوجوان پہلی بار ایک اہم سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئے۔ اس سال منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے پانچویں حصے پر مشتمل افراد کی عمر 40 سال سے کم تھی۔[2]

آج کے سیاسی منظر نامے میں اگرچہ نوجوان بظاہر زیادہ سے زیادہ باخبر ہیں اور پاکستان میں ہونے والے سیاسی واقعات سے جڑے ہوئے ہیں، لیکن وہ پھر بھی عملی طور پر مثبت حصہ نہیں ڈال رہے۔ اس حقیقت کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے ذریعہ نوجوان کارکنوں اور ووٹروں کو تیار کرنے کا کلچر بدستور معدوم ہے۔ سیاسی جماعتوں میں موجودہ نوجوانوں کی جمہوری پرورش کا کوئی واضح اور مضبوط کلچر موجود نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں سیاسی جماعتیں پولنگ کے دن اپنے جلسوں میں شامل ہونے والے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کو انتخابات میں رائے دہندگان کے طور پر اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتیں۔

نوجوانوں کو سیاسی عمل میں شرکت کی اہمیت:

پاکستان انتہائی گنجان آباد ممالک میں سے ایک ہے اور اسے آبادیاتی صورتحال میں ایک قابل غور تبدیلی کا سامنا ہے۔ پاکستان کے نوجوانوں کی اس وقت عمریں 15 سے 29 سال کے درمیان ہیں۔ اس لیے ان کے نظریات، مفادات، موجودہ سیاسی صورتحال کے بارے میں ان کے خدشات اور پاکستان کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے ان کی رائے کو سمجھنا بہت اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان میں نوجوان آبادی کا 60 فیصد نمائندگی کرتے ہیں لیکن سیاسی نظام میں ان کی آواز اور نمائندگی بہت کم ہے۔ سیاسی نظام اور سیاسی عمل میں نمائندگی دینے کے لیے معاشرے کے تمام حصوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ جب نوجوانوں کو سیاسی عمل سے محروم کر دیا جاتا ہے یا انہیں دور رکھا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آبادی کا ایک خاص حصہ یا گروہ ان فیصلوں میں بہت کم آواز یا اثر و رسوخ رکھتا ہے جو اس گروہ کے افراد کے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ سیاسی نظام میں نمائندگی کے اصول کی پامالی ہے۔

[2] https://asiafoundation.org/2018/07/18/pakistan-elections-will-youth-right-the-nations-course/

ایک طویل عرصے تک فرق پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نوجوان باضابطہ سیاسی عمل میں مصروف ہوں اور آج اور کل کی سیاست تشکیل دینے میں اپنی رائے دیں۔ نوجوانوں کی سیاسی عمل میں جامع شرکت نہ صرف ان کا بنیادی سیاسی اور جمہوری حق ہے بلکہ مستحکم اور پرامن معاشرے کی تشکیل اور ایسی پالیسی تیار کرنے کے لئے بھی بہت ضروری ہے جو نوجوان نسل کی خاص ضروریات کی تکمیل کرتی ہیں۔ سیاسی اداروں، سیاسی عمل اور فیصلہ سازی میں نوجوانوں کی مناسب نمائندگی کے لیے، خاص طور پر انتخابات میں حصہ لینے کے لیے، انہیں ان کے حقوق کا پتہ ہونا چاہئے اور ہر سطح پر فعال طور پر حصہ لینے کے لئے انہیں ضروری علم اور تربیت دی جانی چاہئے۔

جب نوجوانوں کے لیے باقاعدہ ادارہ جاتی سطح کے سیاسی عمل میں حصہ لینے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی آواز سنی نہیں جارہی ہے یا سننے کے باوجود بھی انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ یہ مسئلہ مستقل برقرار رہے گا جیسا کہ سیاست دان نوجوانوں کی خواہشات کا جواب دینے میں دلچسپی کھو سکتے ہیں اگر وہ نوجوانوں کے ووٹ نہیں جیت سکتے۔ نتیجتاً نوجوانوں کے معاشرتی مساوات اور انصاف، ماحولیاتی تحفظ اور ثقافتی تنوع کے مطالبہ پر ان کے اصرار کے باوجود انہیں فیصلہ سازی یا کلیدی معاشی وسیاسی امور کے بارے میں بحث ومباحثے میں حصہ لینے محروم کردیا جائے گا۔

نئی اور ابھرتی ہوئی جمہوریتوں میں نوجوانوں کو ابتداء ہی سے باضابطہ سیاسی عمل میں شامل کرنا بہت اہم ہے۔ نوجوانوں کی فعال شراکت جمہوری اقدار کو زندہ کرسکتی ہے جس سے جمہوریت مخالف بیانیے اور طرز عمل کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ممالک جہاں نوجوانوں نے مظاہرے کیے اور آمرانہ حکومتوں کو اقتدار سے ہٹانے پر مجبور کیا، امکان ہے کہ اگر انہیں فیصلہ سازی کے نئے طریقہ کار میں شامل نہ کیا گیا تو وہ خاصی مایوسی محسوس کریں گے۔ یہ جمہوریت سازی کو غیر مستحکم کرسکتا ہے اور تنازعات کی حرکیات کو تیز کرسکتا ہے۔

سیاسی جماعتوں، سول سوسائٹی، اور دیگر انتخابی اسٹیک ہولڈرز نے باضابطہ فیصلہ سازی کے عمل میں نوجوانوں کی شرکت کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اس کردار کو موثر بنانے کے لیے ان تمام امور میں نوجوانوں کی شرکت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی باہم منسلک فطرت کو سمجھنا ضروری ہے جس کا سامنا نوجوانوں سے ہوتا ہے۔ نوجوان نہ صرف جدت اور تخلیقی صلاحیتوں کا متحرک ذریعہ ہیں بلکہ انھوں نے قیامِ پاکستان سے ہی سیاسی نظام، انتقال اقتدار کی حرکیات، اور معاشی مواقع میں اہم تبدیلی میں نہ صرف اپنا اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ اس عمل کو تیز کیا ہے۔ نوجوان بلدیاتی حکومت کے اندر بھی مختلف کاموں کی انجام دہی کے حوالے سے کافی سرگرم کردار ادا کررہے ہیں۔

پاکستان میں جمہوریت اور جمہوری اداروں کو مستقل طور پر مستحکم اور ہم آہنگ کرنے کے لیے نوجوانوں کی اگلی نسل کی سیاسی عمل میں شراکت کو اگلے مرحلے میں پاکستان کی سماجی اور معاشی ترقی کی حکمت عملی کے ساتھ منسلک کرنا ہوگا۔ جاپان، ملائیشیا، اور کوریا جیسی مشرقی ایشیائی

معیشتوں نے انسانوں کے اوپر سرمایہ کاری کر کے اپنی ترقی میں کمال حاصل کیے جس کا تذکرہ آج کل سوشل میڈیا اور پاکستان کے ذرائع ابلاغ میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

نوجوان نسل، جو کسی بھی ملک کا اصل انسانی سرمایہ ہے، کی دیکھ بھال صحت اور تعلیم کے ذریعہ کی جاتی ہے جو ایک گروپ کے اندر معیار زندگی کو تبدیل کرنے کے لیے درکار حرکیات کو آگے بڑھاتا ہے۔ ان مواقع کے علاوہ نوجوانوں کو مزید امکانات اور نعم البدل بھی عطا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ملک نوجوانوں کے لئے بہترین مواقع فراہم نہیں کر رہا ہے تو پوری قوم افراتفری کا شکار ہو سکتی ہے۔ سیاسی استحکام اور جمہوری معیار کو مستحکم کرنا قوم کے مفاد میں اہمیت کا حامل ہے اور اس عمل میں نوجوانوں کی شمولیت اور ان کا کردار انتہائی اہم ہے۔

سیاسی سرگرمی کے دو اہم عوامل ہیں—شہریوں کی شراکت اور سیاسی افادیت کا احساس—جو نوجوانوں کو سیاسی عمل میں حصہ لینے کے فیصلے پر حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ مقامی آبادی اور معاشرے میں نمایاں تبدیلی لانے کے لئے سیاست میں نوجوانوں کی شرکت بہت ضروری ہے۔ جتنا زیادہ نوجوان قومی سطح پر سیاست میں مشغول ہوں گے وہ اپنے ملک کی سیاسی صورتحال کو اتنا ہی بہتر سمجھیں گے اور وہ حکومتی پالیسیوں اور اقدامات پر تعمیری رائے دے سکیں گے۔ پاکستان میں بھی سیاسی جماعتوں نے اپنے ووٹر کے رجحان کو تبدیل کیا ہے اور پارٹی سرگرمیوں میں نوجوانوں کی فعال شرکت کو یقینی بنانے کے لئے نوجوانوں پر توجہ مرکوز کی ہے کیونکہ ووٹر کی وابستگی کا پاکستانی سیاست پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔

نوجوان قیادت کی طاقت اور صلاحیت:

نوجوانوں کی صلاحیت کو تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے، خاص طور پر ان انقلابوں میں جہاں وہ جوش اور ولولہ سے تبدیلی کے لئے سب سے آگے تھے۔ نوجوانوں کی قیادت اور رضاکارانہ خدمات کی سب سے بڑی مثال تحریکِ پاکستان کے دوران ملتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے الگ ملک کا مطالبہ اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا شروع ہی سے طلبا فیڈریشنز کے منشور کا ایک بنیادی حصہ تھا۔ 1940 کی قرارداد پاکستان نے برصغیر کے نوجوانوں کو مسلمانوں کے لئے آزاد سرزمین کی اہمیت سے آگاہی فراہم کی۔ نوجوانوں کی پریشانیوں اور مشکلات کو براہ راست برطانوی حکمرانی کے تحت مروجہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی حالات سے منسلک کیا گیا تھا۔

ایک علیحدہ ریاست کے نظریے سے متاثر ہو کر، نوجوانوں نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور حق خودارادیت کی جدوجہد میں اپنا قابل فخر اور شاندار کردار ادا کیا۔ پاکستان کی تشکیل میں معاشرے کے ہر طبقے کے نوجوانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ مسلم لیگ کا دہلی ونگ پوری طرح سے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دہلی ونگ پر انحصار کرتا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے بھی مسلم لیگ کی صوبائی اور وسطی اسمبلی دونوں انتخابات میں کامیابی میں اور بعد میں پاکستان کی تشکیل میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

فیصلہ سازی کے عمل میں نوجوانوں کی شمولیت اس وقت سیاسی اور معاشرتی گفتگو کا مرکز ہے۔ فیصلہ سازی میں نوجوانوں کی قیادت جسے اکثر "نوجوانوں کی حکمرانی" کے طور پر سمجھا جاتا ہے تنظیم سازی کی مختلف سطحوں پر فیصلہ سازی کی کوششوں میں نوجوانوں کی سرگرمی کو نمایاں کرتے ہیں۔ پاکستان میں نوجوان مرکزی دھارے کی طرح انتخابی ووٹر ہیں۔ نوجوان ووٹر انتخابات کے لئے طاقت کا مرکز ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ ان میں انتخابات کے روایتی انداز اور پارٹی کی درجہ بندی کو تبدیل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کل رجسٹرڈ ووٹوں میں سے 18 سے 29 سال کی عمر کے رائے دہندگان کی تعداد 30.5 فیصد یا 25.76 ملین ہے، وہاں سیاسی استحکام اور اعلی جمہوری اقدار کا بہت زیادہ امکان ہے۔

پریشانی کی بات یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں نوجوانوں کی نمائندگی بہت کم ہے کیونکہ زیادہ تر پرانے سیاستدان پاکستان کی قومی اسمبلی میں نشستیں حاصل کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو مختلف سیاسی جماعتوں کے یوتھ ونگز تک محدود کر دیا جاتا ہے اور انہیں محض سیاسی طاقت جمع کرنے کے لیے ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ فیصلہ سازی کے عمل میں ان کے کردار کو محدود کر دیا گیا ہے اور بدستور سیاست کی صورتحال کی وجہ سے بڑے پیمانے پر انہیں نظرانداز کیا گیا ہے۔ نوجوان اپنی کم عمر، محدود مواقع اور تجربے کے نہ ہونے کی وجہ سے منظم طور پر پسماندہ رکھے جاتے ہیں۔

آج کی روایتی سوچ اور نوجوانوں کی ترقی اور انہیں بااختیار بنانے کے لئے حکمت عملی کسی ملک میں مطلوبہ اصلاحات لانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ شہریوں اور عوام کے مابین تعلقات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مثبت تبدیلی لانے کے لئے پاکستان کی نوجوان قیادت ایک اہم قوت ہے۔ پائیدار ترقیاتی اہداف کے حصول کے لیے نوجوان قیادت حکومتوں کی مدد کرنے کے لئے اہم باہمی کردار ادا کر سکتی ہے۔

نوجوان قیادت میں حقیقی تبدیلی اور خوشحالی لانے اور جمہوریت، جمہوری اقدار، امن اور اچھی حکمرانی کے فروغ کی بے حد صلاحیت موجود ہے۔ آج کے نوجوان بااختیار ہیں اور وہ بہت سارے طریقوں سے سوشل میڈیا پر سماجی تحریکیں چلا کر تبدیلی میں حصہ ڈال رہے ہیں۔ پاکستان میں نوجوانوں کی اکثریت بطور نعمت تصور کی جاتی ہے جب اس کے نوجوانوں نے اپنی مقامی برادریوں کی بہتری کے لیے خود اقدامات اٹھا کر بڑھتے ہوئے سیاسی، معاشی اور انتظامی مسائل کو دور کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو پیش کرتے ہوئے موجودہ سیاسی نظام کو تبدیل کرنے کے رجحانات کا مظاہرہ کیا۔ نوجوان خاص طور پر اپنی مقامی برادریوں میں شعور پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

آج پاکستان میں نوجوانوں قیادت کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ وہ قوم کے مقدر کے تحفظ کے لئے انقلابی اقدامات کریں۔ وہ لامحدود طاقت کا مرکز اور منبع ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں بہتر پلیٹ فارم فراہم کرکے اور ان کی استعداد کار کو بڑھا کر ان کی طاقت اور جدوجہد پر توجہ دی جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری قوم کا مستقبل ہمارے حوصلہ منداور پرجوش نوجوان قائدین اور رضاکاروں

کے ہاتھ میں ہے۔

باب ہفتم: نوجوانوں کے حقوق اور سیاسی عمل میں شرکت میں درپیش چیلنجز

نوجوان عالمی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں۔ انہیں خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں سماجی تبدیلی اور ترقی کے لئے بہت اہم ایجنٹ سمجھا جاتا ہے۔ یو این ڈی پی کی رپورٹ میں تین عناصر "تعلیم، روزگار، اور مشغولیت" کا تجزیہ کیا گیا ہے جنہیں نوجوانوں میں تبدیلی کے کلیدی عوامل سمجھا گیا ہے۔ یہ محرکات نوجوانوں میں تجربات کی تشکیل کرتے ہیں جب وہ جسمانی، جذباتی اور مالی انحصار سے خود انحصاری کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور اپنے کنبے اور اقرباسے ماوراہو کر معاشرے کے ساتھ مشغول ہونا شروع کر دیتے ہیں۔

لہذا نوجوانوں کو صحیح سمت میں مصروف کرنے کے لیے بہتر پالیسیاں تیار کرنا اور مناسب مہارتوں اور صلاحیتوں سے ان کو بااختیار بناتے ہوئے معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لئے تیار کرنا ضروری ہے۔ نوجوانوں کو مصروف رکھنے کی حکمت عملی میں نوجوانوں کی صلاحیتوں اور قابلیت کی نشوونما کے لیے بنیادی شرائط اور تحفظات کا ایک مجموعہ بنانا چاہئے۔ لہذا ان پالیسیوں کو ایک کثیر جہتی اور ہم آہنگ نقطہ نظر سے ڈیزائن کیا جانا چاہئے جس میں تعلیم، روزگار، صحت، تشدد، ثقافت اور سیاسی شراکت کے شعبوں کو بھی لینا چاہیے۔

(تصویر 1 ملاحظہ فرمائیں)

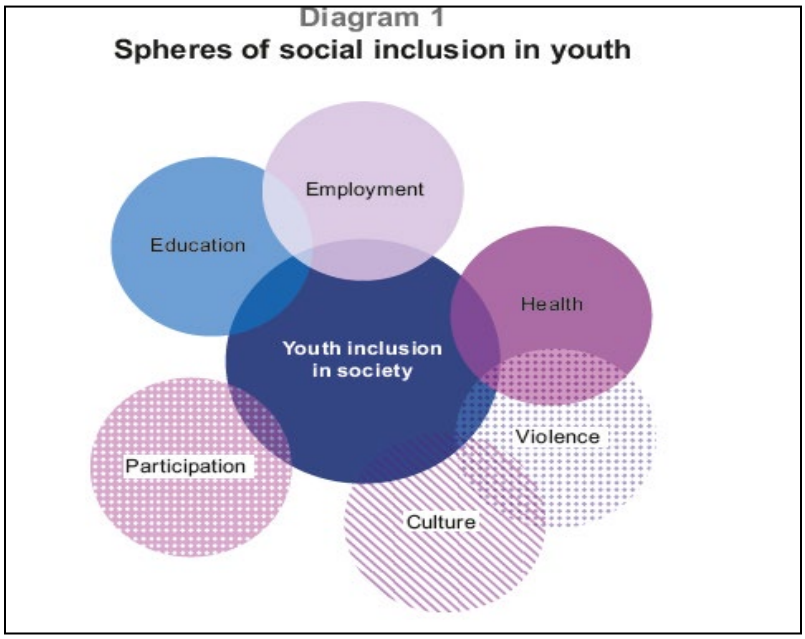

پاکستان میں نوجوانوں کی پالیسیاں:

نوجوانوں کی ترقی کے لئے حکمت عملی مرتب کرنے کے لئے نوجوانوں کی پالیسیاں تیار کی جاتی ہیں۔ان پالیسیوں کا مقصد نوجوانوں سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے راستے تلاش کرنااور نوجوانوں کی ترقی کے حصول کے لئے عملی منصوبہ تیار کرنا ہے۔ حکومت کی جانب سے قومی یوتھ پالیسی نوجوانوں کو بہتر ماحول اور بہتر زندگی کے مواقع فراہم کرنے کا عہد ہے۔ پاکستان نے 2009 میں اپنی قومی یوتھ پالیسی اختیار کی، لیکن آئین میں 18 ویں ترمیم کے بعد تمام صوبوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ مرکزی یوتھ پالیسی اپنانے کے بجائے خود اپنی یوتھ پالیسی بنائیں۔ لیکن تاحال تمام صوبوں نے اپنی نوجوانوں کی پالیسیاں نہ تو بنائی ہیں اور نہ ہی کامیابی کے ساتھ نافذ کی ہیں۔ حکومت کی قومی یوتھ پالیسی کی کچھ اہم خصوصیات میں درج ذیل نکات شامل ہیں: [3]

1. احساس تفاخر، آگاہی اور ترغیب کو تقویت دینا
2. قومی یکجہتی کو فروغ دینا
3. نوجوانوں کے لئے آمدنی کے امکانات مہیا کرنا
4. ہنر مند بنانا
5. چھوٹے اور آسان قرضے
6. انٹرنشپ اور ملازمت سے متعلق مشاورت
7. پسماندہ اور غیر محفوظ نوجوانوں کے امور کو حل کرنا
8. کردار سازی کی حمایت کرنا
9. کھیلوں اور تفریح کو فروغ دینا
10. تعلیمی اور فکری ترقی
11. نوجوانوں کی صحت

نیشنل یوتھ پالیسی نوجوانوں میں احساس تفاخر اور قومی یکجہتی کے جذبات کو فروغ دینے کا یقین دلاتی ہے اور اس کا مقصد انہیں رکاوٹوں اور چیلنجوں سے نکلنے میں ان کی صلاحیتوں کی نشاندہی کرنے اور ان کو بروئے کار لانے کے لئے رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ طویل مباحثوں اور افسر

[3] National Youth Policy, Government of Pakistan, Ministry of Youth Affairs, 2008
https://www.youthpolicy.org/national/Pakistan_2008_National_Youth_policy.pdf

شاہی کی مداخلتوں کے باوجود پاکستان کی قومی یوتھ پالیسی کو 2009 میں کامیابی کے ساتھ، متعارف کرایا گیا۔ لیکن پالیسی سازی کے لئے اوپر سے نچلی سطح والی اپروچ کا مسئلہ اب بھی برقرار ہے جو کہ نچلی سطح پر موجود یعنی ملک کے عام نوجوان کے اصل مسائل کو نظرانداز کرتا ہے۔

پاکستان میں نوجوانوں کو درپیش چیلنجز:

پچھلے کچھ سالوں میں عالمی سطح پر نوجوانوں کی متعدد تحریکیں ابھری ہیں جو ان کے مطالبات کو سنے جانے کے حوالے سے ایک بیدار کرنے والی پکار (ویک اپ کال) تھیں تاکہ وہ ان معاشروں، جس میں وہ رہتے ہیں، کی ترقی میں ایک فعال کردار ادا کر سکیں۔ نوجوان اکثر محسوس کرتے ہیں کہ روایتی سیاسی بیانیہ، دائرہ کار اور طریقہ کار ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اگرچہ مساوات اور سماجی انصاف، ماحولیاتی تحفظ، اور ثقافتی تنوع کے مطالبے نوجوانوں کے طرف سے اٹھتے ہیں لیکن وہ فیصلہ سازی میں یا کلیدی سماجی و اقتصادی امور پر گفتگو میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔

دنیا بھر کے نوجوانوں کی طرح پاکستانی نوجوانوں کو بھی بے شمار مسائل اور چیلنجوں کا سامنا ہے۔ معاشی چیلنجز، بنیادی سطح پر معیاری تعلیم اور اعلی تعلیم تک رسائی، صحت، شدت پسندی اور سیاسی استحکام کی کمی، خاص طور پر پاکستانی نوجوانوں کو درپیش بڑی مشکلات ہیں۔ پاکستان کے نوجوانوں کو سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی ترغیب دینے کے لئے سیاسی لاتعلقی اور عدم استحکام ایک اور بہت بڑا چیلنج ہے۔ ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں نوجوانوں کو دوبارہ شامل کرنا اور ان کی تنظیم کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

سیاست اور معاشرتی ترقی کی نچلی سطح پر نوجوانوں کی محدود مشغولیت ہے، خاص کر معاشرے کے پسماندہ اور غیر نمائندہ طبقات میں۔ پاکستان جیسی کمزور جمہوریت میں جہاں سیاسی نظام ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، وہاں نوجوانوں کا سیاسی عمل میں شرکت کرنا بھی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ مزید یہ کہ نوجوان پوری آبادی کا نمائندہ ہونے کے باوجود بے بسی اور بے اختیاری کا مظہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب سیاسی جماعتوں نے اپنے منشور میں نوجوانوں کے کردار کو فروغ دینا شروع کر دیا ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ سیاسی جماعتوں میں نوجوانوں کو بڑے اور اہم عہدوں پر تفویض کرنا ہوگا۔ ملکی اقتدار کے ڈھانچے میں نوجوانوں کی کم حصہ داری کی وجہ سے، نوجوانوں کی نمائندگی کم ہے۔ اس کی وجہ سے سیاسی میدان میں نوجوانوں کا کردار کم سے کم نظر آتا ہے۔ نوجوان قیادت اور نوجوانوں کے زیر قیادت اقدامات میں ایک خلا موجود ہے جو عصری چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

میلینیم ڈویلپمنٹ گولز (ایم ڈی جی۔ ہزار سالہ ترقی کے اہداف) بالواسطہ تمام ممالک میں نوجوانوں کی فلاح و بہبود کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مقرر کردہ یہ اہداف نوجوانوں کو معیاری وسائل اور سہولیات کی دستیابی کی جانچ کرتے ہیں، جن میں اچھی صحت، صنفی مساوات، مفت پرائمری تعلیم اور ملازمت شامل ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان اپنے ایم ڈی جی اہداف حاصل کرنے میں بہت پیچھے ہے۔ خاص طور پر صحت کی

ناقص سہولیات، نوجوانوں کی بے روزگاری کی صورت میں غربت، اور اسکولوں سے باہر بچوں کی بڑی تعداد نے پاکستان میں نوجوانوں کے خوفناک حالات کو نمایاں کیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے بہت سارے شواہد موجود ہیں کہ سرمایہ کاری کی کمی اور نوجوانوں کی ضروریات کے بارے میں عدم توجہ کا نتیجہ ترقیاتی مواقع کا ضیاع، خراب صحت اور معاشرتی، جسمانی، ذہنی خلل کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے موجودہ 'اثاثے' کے ساتھ ساتھ والدین اور رہنماؤں کی اگلی نسل کی مکمل حمایت کرنے میں ناکامی ہے۔

یہ صورتحال نوجوانوں کے بڑے مسائل کو دور کرنے کے لئے نوجوانوں کی مؤثر پالیسی کو فوری طور پر تشکیل دینے اور ان پر عمل درآمد کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور نوجوانوں پر اثر انداز ہونے والے سماجی اور و معاشی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے بڑے پیمانے پر پبلک پرائیویٹ شراکت داری کی ضرورت کی تجویز پیش کرتی ہے۔ ان پڑھ، غیر تربیت یافتہ اور بے روزگار نوجوان پاکستانی نوجوان آبادی کا بڑا حصہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر اسکول چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ یا کوئی ہنر سیکھ کر نوکری کر لیتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 32 فیصد سے زیادہ غیر ہنر مند نوجوان، خواتین سمیت، موجود ہیں۔

گزشتہ سالوں کے دوران پاکستان نے عوامی مقامات کو حیران کن طور پر سکڑتے دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ نوجوانوں کو مختلف لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ مشغول ہونے کے بہت کم مواقع دیکھے گئے ہیں۔ یو این ڈی پی کے نتائج کے مطابق 60 فیصد نوجوان کبھی بھی دوسرے صوبے میں نہیں آئے اور 90 فیصد نوجوانوں کو کبھی بھی کھیلوں کی سہولیات تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ اس کے علاوہ 75 فیصد نوجوانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے غیر مسلموں کے حق کو تسلیم نہیں کیا۔ اپنی کمیونٹی سے سے باہر افراد سے واقفیت اور روابط نہ ہونے کی وجہ سے بہت سارے نوجوان تیزی سے فرقہ واریت اور عدم برداشت کے بیانیہ کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ نوجوانوں کو بنیادی سہولیات تک بہتر رسائی پر توجہ دی جائے تاکہ وہ اپنی کمیونیٹیز میں مصروفیت کو فروغ دیں اور عدم رواداری کو کم کرنے کے لئے انہیں موثر ذرائع مہیا کیے جائیں۔

اسی طرح سیاسی مشغولیت بھی ایک چیلنج ہے۔ یو این ڈی پی کے سروے میں نوجوانوں میں سیاست پر عدم اعتماد کی واضح علامت کا اشارہ کیا گیا ہے، صرف 24 فیصد سیاستدانوں پر اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ پچھلے انتخابات میں نوجوان سیاسی طور پر متحرک رہے اور پانچ میں سے چار نوجوانوں نے ووٹ ڈالے اور 60 فیصد سے زیادہ دوبارہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ نوجوان واقعی سیاسی عمل اور برادریوں میں سرگرم شراکت دار بننے کے خواہشمند ہیں، لیکن ایسا کرنے کے لئے باضابطہ وسائل کا فقدان ہے۔[4]

[4] https://blogs.lse.ac.uk/southasia/2016/05/13/youth-bulge-or-bomb-harnessing-the-potential-of-pakistani-youth/

پاکستانی نوجوان معاشرے میں امن اور خوشحالی لانے میں اپنے کردار کے بارے میں بہت ہی پُر جوش اور پر امید ہیں۔ لیکن اصل چیلنج حکومت اور اس کے ادارہ جاتی شراکت داروں کے ساتھ ہے کہ وہ ایسے پروگرام اور پالیسیاں تیار کریں جو ان تیار نوجوانوں کو معاشرے کے لئے کام کرنے اور تبدیلی لانے کا موقع فراہم کر سکیں۔ پاکستانی نوجوانوں، دیہی اور شہری، مرد اور خواتین کو مختلف سطحوں پر بہت سارے مسائل اور چیلنجز کا سامنا ہے۔ پالیسی سازوں کو آبادیاتی اثرات کو دور کرنے کے لیے طویل مدتی منصوبے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ بڑے پیمانے پر نوجوان حکومت کے خالی وعدوں اور نوجوانوں پر مبنی ترقیاتی پالیسیوں کے نفاذ میں پیشرفت نہ ہونے سے مایوس ہو رہے ہیں۔

اس سے ملک میں نوجوانوں کے حالات بہتر بنانے کے لئے عملی اقدامات کرنے کی سرکاری و نجی کوششوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پورے عمل میں نوجوانوں کا مرکزی فعال کردار ہے۔ پاکستان میں نوجوانوں کی سیاسی شرکت کے امور کا جائزہ لیتے ہوئے نوجوان تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں اور وہ ملک میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں سے بھی واقف ہیں، لیکن جب سیاست میں فعال شرکت کی بات کی جائے تو وہ متوقع سطح سے کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ سیاسی خواندگی کی کمی کی وجہ سے زیادہ تر نوجوان سیاست کو سرگرمی کی ایک غیر فعال شکل سمجھتے ہیں۔

ہم ان چیلنجوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

سماجی اقتصادی ترقی کے لئے پاکستان اپنے نوجوانوں کو مناسب تعلیم، مہارتیں، رویوں میں تبدیلی، سماجی آگاہی، اور جوش وولولہ سے آراستہ کرنے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس آپشن سے نہ صرف معاشرے میں خوشحالی، معاشرتی ہم آہنگی، سماجی ربط اور امن آئے گا بلکہ معاصر پاکستانی معاشرے کو درپیش متعدد چیلنجوں پر قابو پانے میں بھی مدد ملے گی۔ نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت اور شمولیت کا ان تین بنیادی جہتوں پر تجزیہ کیا جاتا ہے جن پر نوجوانوں کی مشغولیت کی پالیسی اور حکمت عملی میں توجہ دی جاتی ہے۔

- نوجوانوں کی سماجی شمولیت کے فروغ اور تحفظ کے لئے ادارہ جاتی ترقی۔ اس جہت میں منصوبہ سازی، تعاون اور اداروں کے روابط کے تجزیہ کے لیے استعداد کار، اور نوجوانوں پر اثرانداز ہونے والی پالیسیاں نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے ہم آہنگ تدبیر کا قیام شامل ہیں۔
- مربوط حلقہ وارانہ پالیسیوں کے نفاذ کے ذریعے، مساوات اور حقوق پر مبنی تناظر کے ساتھ، زندگی کے اس مرحلے کے اہم شعبوں میں سماجی شمولیت کے معروضی خلا کو ختم کرنا۔
- سماجی شمولیت: نوجوانوں کی ضروریات اور خیالات کو سننے اور سمجھنے کے بارے میں ہے جو ان کی سماج میں شمولیت کے متعلق ہو، جس کا مقصد پالیسی بنانا اور اسے عمل میں لانا ہے۔

اس کے علاوہ نوجوانوں کو فعال کرنے کے لئے ایک نئے نظریہ کی ضرورت ہے جو خود استحکام، امن کی تعمیر اور ملک کی خوشحالی کا باعث بن سکتا ہے۔ پاکستانی نوجوانوں کو قومی تہذیبی عمل میں لانے اور نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت کی حوصلہ افزائی کے لیے بہترین اور قابل توجہ پالیسیوں کا ہونا بہت لازمی ہے۔

پاکستانی نوجوانوں کی ایک جھلک [5]

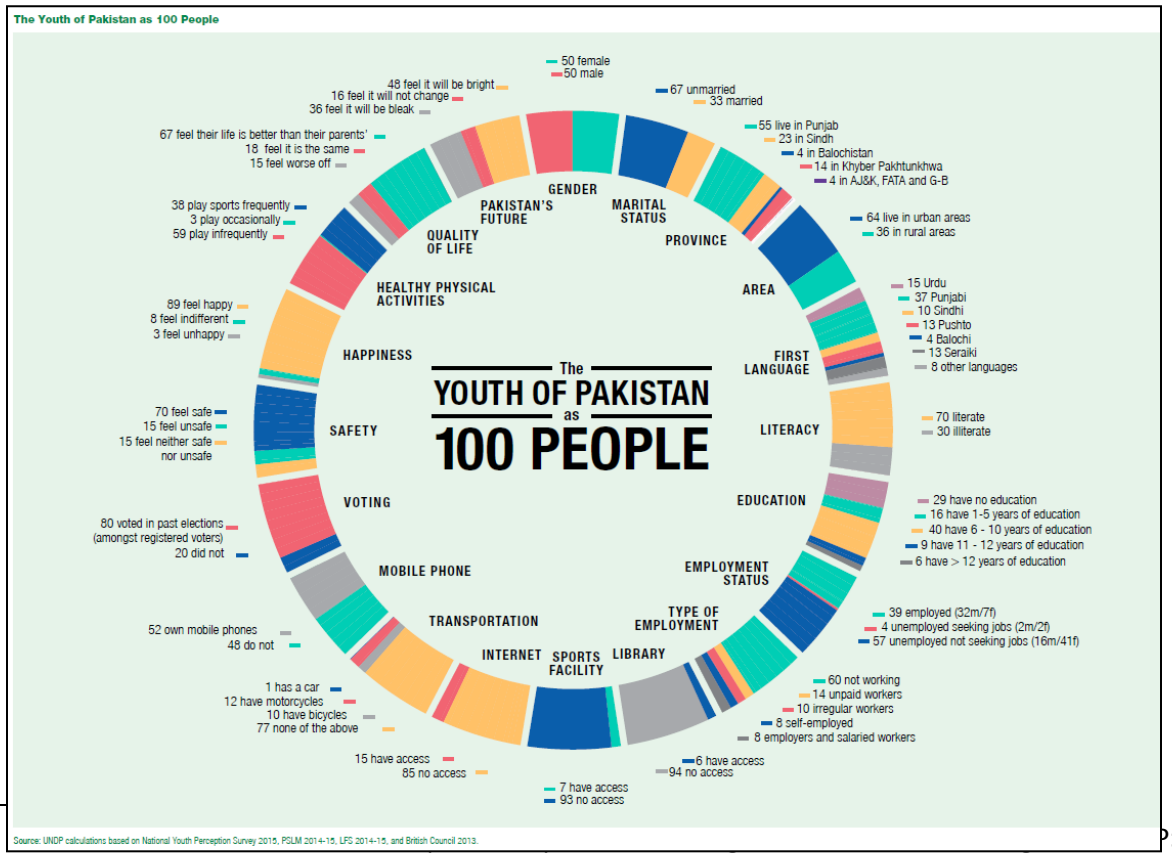

[5] https://www.pk.undp.org/content/pakistan/en/home/library/human-development-reports/PKNHDR.html

باب ہشتم: جمہوری نظام کو مضبوط بنانے اور امن کو فروغ دینے کے لئے نوجوانوں کے اقدامات اور سرگرمیاں

عام طور پر اتفاق رائے ہے کہ اب تک کسی طرح کی بھی جمہوریتوں کا آپس میں مقابلہ نہیں ہوا۔اس کی بنیادی وجہ اور خیال یہی ہے کہ "جمہوریت امن کا ایک اہم سبب ہے۔" یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "جمہوریت میں امن وامان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جمہوری ادارے سرکاری حکام کو ووٹروں کے سامنے جوابدہ بناتے ہیں۔ نوجوانوں کی فعالیت اور قیادت دنیا کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اسی لیے مستقل اور پائیدار ترقی کے لئے نوجوانوں کو ناگزیر کارکن کے طور پر تسلیم کیا جارہا ہے۔ لیکن ان کی فعال مصروفیت کو سپورٹ کرنے کے لیے اور نوجوانوں کی سیکھنے کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے مزید کام کی ضرورت ہے۔

جمہوری اداروں کو نوجوانوں کے خدشات اور مفادات کے لیے کشادہ ذہن ہونا چاہئے اور ان کی سیاسی عمل میں شمولیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا وہ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ وہ نوجوان خود اس سیاسی عمل اور امن کا ایک اہم حصہ ہیں۔اس کے بدلے میں جمہوریت نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت کے ذریعہ جمہوری اداروں کی قبولیت، تفہیم اور ترقی کا مطالبہ کرتی ہے۔ لہذا، نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت، جمہوریت سازی اور امن کے لیے نوجوانوں کی مستقل مشغولیت اور اداروں کے لیے مستقل رسائی ہونا ضروری ہے۔

نوجوانوں کو عملی قدم اٹھانے کے قابل بنانا:

سیاسی عمل میں نوجوانوں کی شرکت کے لیے سرمایہ کاری کرنا، کسی بھی ملک کی سب سے زیادہ حکمتِ عملی پر مبنی سرمایہ کاری ہے۔ سیاسی میدان اور امن کی تعمیر میں ان کی شمولیت کے اعتبار سے نوجوانوں پر حالیہ توجہ نسبتاً نئی ترجیح ہے۔خاص طور پر حالیہ جمہوری تبدیلیوں اور تنازع کے بعد پاکستانی معاشرے کی بدلتی حرکیات کی روشنی میں یہ اہم قدم ہے۔اگر بنیادی اور ضروری مواقع اور سہولیات جیسے معیاری تعلیم، فائدہ مند روزگار، بامقصد مصروفیت، اچھی ذہنی اور جسمانی صحت، اور تجارتی مہارتیں مہیا کی جائیں تو نوجوان مقامی سطح پر بہتری لانے کے لئے بہترین فیصلے کرنے کی اہلیت اور اختیار حاصل کر سکتے ہیں۔ بااختیار نوجوان نہ صرف اپنے لیے اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں بلکہ وہ معاشرے پر بھی بڑے پیمانے پر مثبت اثر ڈال سکتے ہیں۔اس عمل میں دو اہم عناصر شامل ہیں: (1) یوتھ ایجنسی کو تبدیلی کے آلہ کار کے طور پر مضبوط بنانا (2) نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت کے لئے سازگار ماحول کو فروغ دینا۔

یوتھ ایجنسی سے مراد وہ شخصی خصوصیات اور صلاحیتیں ہیں جو نوجوانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر کام کرنے کے اہل بناتی ہیں۔ جبکہ سازگار ماحول سے مراد ایسے نظامی عوامل مراد ہوتے ہیں جو نوجوانوں کی سیاسی شرکت کو بڑھاتے ہیں یا روک سکتے ہیں۔ نوجوانوں کی ایجنسی کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس بات کو سیکھا جائے کہ نوجوانوں کی سیاسی عمل میں مشغولیت کی منفرد تدبیر کو کیسے آراستہ کیا جائے۔ نوجوانوں کی سیاسی تنظیم سازی اور "باریک مہارتیں" جیسے علم، ہنر، طرز عمل، اور ذاتی خصوصیات کی تشکیل کی جائے جو ان کی مؤثر سیاسی شرکت کو یقینی بناتی ہیں۔ یوتھ ایجنسی کی تعمیر کے لئے طریقہ کار یہ تقاضا کرتا ہے کہ شناخت، مقام، ثقافت اور دیگر متعلقہ حالات کی بنیاد پر متنوع نوجوانوں میں مختلف ضروریات اور نکتہ آغاز کو جانا جائے اور اس کا شمار کیا جائے۔ اور ایک اہم بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو سیاسی ایکٹر تسلیم کرنے کے بغیر، امن کی تعمیر اور جمہوریت کے استحکام میں ان کی پوزیشن کو نظرانداز کر دیا جائے گا، یا ضائع کیا جائے گا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکے گا۔ ایک مددگار ماحول کو فروغ دینے کے لئے درج ذیل کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے:

ساختیاتی (structural) ناانصافیوں کو پہچانیں اور ان کو حل کریں جو صنفی یا دیگر معلوم عوامل کی بنیاد پر نوجوانوں کو نقصان دیتی ہیں۔

نوجوانوں کے لئے مقتدر حضرات کے ساتھ گفتگو اور تعلقات استوار کرنے کے لئے پلیٹ فارم مہیا کریں۔

قیادت اور تعمیری مشغولیت کے مظاہروں کے ذریعہ نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شرکت کی اہمیت کو اجاگر کریں۔ اور مختلف طبقات کے مابین باہمی تعلقات کو باہمی تعاون کے ذریعے مضبوط بنائیں۔

نوجوانوں کی ان سرگرمیوں اور مقتدر رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کے اس عمل کو بار بار دہرانا چاہیے تاکہ جمہوریت، امن، اور کمیونٹی سے متعلق امور کو حل کرنے کے لئے باہمی اشتراک کے عمل اور تعاون کو قائم کیا جائے۔ اگر شہریوں اور سیاسی قائدین کو اس عمل کے نتیجے میں مثبت تبدیلی نظر آتی ہے تو وہ نوجوانوں پر بطور رہنما زیادہ بھروسہ کرنا شروع کر دیں گے۔ اس کے نتیجے میں اقتدار کے راستے، ادارے اور تنظیمیں ایک مخصوص اتھارٹی کے ساتھ نوجوانوں کے اقدامات اور قیادت کے لیے کھل جائیں گے۔ یہ عمل خود ہی فائدہ دیتا رہتا ہے اور بالآخر یوتھ ایجنسی میں بہتری اور توسیع ہوتی ہے اور نوجوانوں کی آواز کو مزید معاون ماحول فراہم ہوتا ہے۔ چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے، اس لیے طاقت کی حرکیات بدستور نمو پذیر رہتی ہیں اور نوجوانوں کی ہمراہی میں سیاسی نظام برقرار رہتا ہے۔

اس سلسلے میں لوکل تناظر میں مفید علم اور مہارت کی فراہمی پر توجہ شاید زیادہ عملی صورت ہو۔ بصورت دیگر صرف تھیوریٹیکل تعلیم کو بہتر بنانا نوجوانوں کی ترقی کے طریقہ کار کے پریکٹیکل حصے کو منقطع کر سکتا ہے۔ کچھ کیسز میں معلومات اور مہارت کا تعلق پالیسی کی وکالت، سیاسی عمل کی نگرانی، کسی مسئلے کے بارے میں شعور اجاگر کرنے، تحقیق کرنے اور پالیسی بریف تیار کرنے، یا کسی آفس کو چلانے سے

متعلق ہو سکتا ہے۔ان میں سے ہر ایک کی سر گرمی کے لیے مخصوص علم اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جس کا تعلق پالیسی کے تجزیے سے لے کر تعمیر و ترقی کے لیے حکمتِ عملی کی منصوبہ بندی تک ہے۔

ضرورت واہمیت اس بات کی ہے کہ ساختیاتی اور ثقافتی تشدد کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لئے نوجوانوں کو مثبت اور جمہوری امن کے نمائندہ کے طور پر تصور کیا جائے اور اس نظام کا بغور مطالعہ کیا جائے۔اس کے علاوہ وسیع تر سماجی تبدیلی کے لیے نوجوانوں کو مشغول کیا جائے تاکہ متشدد انتہا پسندی، ظالمانہ اور کلاس سسٹم کے نظام کو تبدیل کیا جائے اور سلوک، تعلق اور رویوں کو بہتر بنایا جائے۔

امن کی تعمیر اور جمہوریت میں نوجوانوں کی شمولیت کو سمجھنے کے لیے نوجوانوں کو متحرک کرنے اور ان کی بحالی کے عوامل کو سمجھنا چاہئے، جیسا کہ وہ کون ہیں اور وہ جسمانی، سماجی معاشی اور نفسیاتی طور پر کیا تجربہ رکھتے ہیں۔عدم تشدد کی سیاست میں نوجوانوں کی شمولیت اور وسیع تر نقطہ نظر سے ان کی سیاسی ایجنسی کو زیادہ مثبت، جمہوری اور امن پسند کردار میں اہم بنانا بہت ضروری ہے۔جمہوری عمل اور امن کی تعمیر میں نوجوانوں کو بطور فعال کارکن نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ ان کو درپیش چیلنجز کا ازالہ نہیں کیا جاتا۔

نوجوانوں کو امن کی تعمیر اور جمہوریت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لئے تربیت کے مواقع فراہم کرنا ضروری ہے۔نوجوان اپنی جوانی کی قوت اور مہارت کے ساتھ اور نئے ٹیکنکل رجحانات کو اپنانے کی صلاحیت کے ساتھ ،ثالث ،رضاکار، سماجی محرک اور فلاحی کارکن کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔کسی بھی تصادم زدہ علاقے سے وابستہ گروپ کی طرح نوجوانوں کی صلاحیتوں کو متحرک کرنے کے لئے ایک طویل مدتی پالیسی اور طریقہ کار کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ آرٹس، ثقافت، سیاحت، کھیل اور تعلیم کے ذریعہ نوجوانوں کی تعمیرِ امن اور جمہوریت میں شمولیت کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ان شعبوں میں نوجوانوں کی جدت اور تخلیقی صلاحیتوں کو مؤثر طریقے سے فعال کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ امن کی تعمیر کے وسیع مقاصد اور جمہوری اقدار کو فروغ دے سکیں۔ منقسم طبقات کے مابین پل تعمیر کریں اور مفاہمت کے عمل کو یقینی بنائیں۔

نوجوانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ معاشی مواقع ضروری ہیں تاکہ انہیں اپنی زندگی میں پر امن اور نتیجہ خیز راستوں پر چلنے کے لئے ترغیب مل سکے۔نوجوان ہنر سیکھنے اور کاروباری صلاحیتوں کو فروغ دینے کے مواقع میں اضافہ کرنے کے خواہاں ہیں،اس لیے یہ مواقع ان کو دستیاب ہونے چاہییں۔نوجوان اور بوڑھے دونوں نسلوں کی بنیادی پریشانی اپنی روزمرہ کی فلاح و بہبود کو یقینی بنانا ہے،یعنی معاش حاصل کرنا اور تعلیم حاصل کرنا ہے۔ان مسائل کے حل ہونے کے بعد ہی نوجوانوں کی سیاسی عمل میں دلچسپی بڑھانا ممکن ہو گا۔

قیامِ امن اور جمہوریت کے لئے نوجوانوں کے اقدامات:

نوجوانوں کی سوچ و فکر کی حمایت:

پاکستانی معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی اس بارے میں ایک واضح فکر ہے کہ امن کیوں اور کیسے ہونا چاہئے، اس لیے وہ پرامن مستقبل کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ لہذا امن کے قیام کے عمل کے منصوبے اور پھر عملی نفاذ میں نوجوانوں کے خیالات اور رائے کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔ پبلک پالیسی میں امن کے قیام کے لیے نوجوانوں کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور ہر قسم کے تشدد کو انسداد، جمہوری ذرائع اور تعلیم کے پروگراموں کے ذریعے ختم کیا جائے۔ اس بات پر بھی عالمی اتفاق رائے ہے کہ نوجوان تنازعات کی روک تھام اور حل میں اپنے کردار کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس بات کو سراہا جاتا ہے کہ پرامن، ہم آہنگ اور محفوظ معاشروں کی ترقی کے لئے نوجوانوں کا کردار ایک ناگزیر شرط ہے۔ نوجوانوں کے کردار کی اہمیت کا اعتراف نوجوانوں کے ایسے گروہوں کی صورت میں ابھرا ہے جو خاص طور پر تشدد کی روک تھام کے لیے بنائے گئے ہیں۔

فعال شہریت:

نوجوان لوگوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اور اس بات کی ضمانت دینے کے لئے کہ ان کے بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم اور نافذ کیا جارہا ہے، نوجوانوں کی اپنے معاشرے اور جمہوری عمل میں فعال اور بامقصد شرکت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ رسمی اور غیر رسمی مشغولیت دونوں کو سیاسی شرکت کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور یہ دونوں قسم کی شمولیت جمہوریت کے لئے فائدہ مند ہیں اور ان کی تائید کی جانی چاہئے۔

سیاسی عمل میں نوجوانوں کی بامعنی شرکت اور قیادت کا تقاضا ہے کہ نوجوان افراد اور نوجوانوں کی زیر قیادت تنظیموں کو مواقع اور صلاحیتیں حاصل ہوں اور وہ قابل عمل ماحول اور متعلقہ مفید پروگراموں اور پالیسیوں سے ہر سطح پر مستفید ہوں۔ امن اور ترقی کے متفقہ بین الاقوامی اہداف کے حصول کو یقینی بنانے کے لئے نوجوانوں کے جمہوری عمل اور طریقوں میں شرکت کے حق کا احساس کرنا بھی ضروری ہے۔

کمیونیٹیز کے مابین مکالمے اور تبادلہ جات کو فروغ دیں:

عدم اعتماد، دقیانوسی تصورات اور تعصبات کا مقابلہ نوجوانوں کے اقدامات سے کیا جاسکتا ہے۔ نوجوانوں کو تعلیمی تبادلوں اور ایکسپوژر دوروں کے ذریعہ متحرک کرنا چاہئے جو مختلف کمیونیٹیز کے نوجوانوں کے مابین مستقل گفتگو اور مشغولیت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ خاص طور پر ان نوجوان طبقات کے لئے اہم ہے جو بالواسطہ تنازعات کا شکار یا متاثر ہوئے ہیں۔ نوجوانوں کی مشکلات اس حقیقت کی وجہ سے ہیں کہ ان کی نشو و نما اس عہد میں ہوئیں جب پاکستان محاصرے کی حالت میں تھا۔ نوجوانوں کے پاس بیرونی دنیا سے معلومات حاصل کرنے کے کوئی وسائل نہیں تھے۔

فورم اور مکالمہ:

نوجوانوں کو بااختیار بنانے اور انہیں مقامی اور قومی سطح پر فعال شہری بننے کے لیے یوتھ پارلیمنٹ اور یوتھ فورمز کا قیام عمل میں لایا جائے اور انہیں یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ قانون سازوں (پارلیمنٹیرین) کے ساتھ براہ راست مکالمہ کر کے قومی پالیسی کی تشکیل دے سکیں۔

نتیجہ:

نوجوان آبادی کی اکثریت ہیں اور پاکستان کا مستقبل ہیں، اس تناظر میں پرامن اور جمہوری ترقی کے لئے مثبت رول ماڈل تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ملکی استحکام اور لوکل کمیونیٹیز کے چیلنجز سے نمٹنے کے لئے نوجوانوں کی سرگرمیوں کے مواقع کو بڑھانا اور انہیں سیاسی میدان میں جگہ فراہم کرنا اس وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔